مسز رابعہ اقبال :

نشاط کی بکٹ کہانی
اور طالب کا تیرہ ماسہ

بارہ ماسہ اپنے موضوع کے اعتبار سے گیت سے ملتی جلتی ایک طویل بیانیہ صنفِ نظم ہے۔ یہ اپنی موجودہ حالت میں خالصتاً ہندوی الاصل ہے اور ہندوی جذبات کی حامل ہے۔ سنسکرت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بارہ ماسہ ایک فراقیہ نظم ہے۔ اس میں ایک ہجر کی ماری ہوئی عورت اپنی کتھا اور بپتا دکھ بھرے لہجے میں سناتی ہے۔ شوہر سے جدائی اس کے دل و دماغ پر جو کیفیات و اثرات پیدا کرتی ہے، اُن کی تفصیل ماہ بہ ماہ موسم کی خصوصیات کے ساتھ بیان کرنے کا نام بارہ ماسہ ہے۔ ہندی ادب میں عورت عاشق اور مرد محبوب ہوتا ہے۔ اس کی جدائی اور ہجر و فراق کی تمام کیفیات عورت ہی کی زبان سے بیان کی جاتی ہیں۔ وہ اپنے ساجن کی جدائی میں ایک ایک دن، بے قرار روح کی طرح گذارتی ہے۔ سال کے بارہ مہینے کی سرگذشت، موسم کی تبدیلیوں کے ساتھ جو اس کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہوتی ہیں، کبھی اپنی سکھیوں کو سناتی ہے، کبھی خود کلامی کرتی ہے۔ وہ جب اپنی سہیلیوں کو ساون مناتے یا تہوار پر، بنتے سنورتے اور خوشیاں سمیٹتے دیکھتی ہے تو اس کے کلیجے میں برہا کی آگ سلگنے لگتی ہے۔ ہندوستان میں موسم برسات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندی ادب میں اس کا بالتفصیل ذکر ہے۔ بادل گرجتے ہیں، کالی کالی

گھٹائیں ہر طرف نظر آتی ہیں، کوئل کوکتی ہے، پپیہا، پی پی کی رٹ لگاتا ہے، باغوں میں جھولے پڑتے ہیں، پکوان کا اہتمام کیا جاتا ہے تو ایسے میں اس کا کلیجہ منہ کو آتا ہے اور وہ اپنے پیا کی یاد میں تڑپنے لگتی ہے۔ غرض ہر ماہ کی الگ الگ کیفیاتِ ہجر و فراق اس پر طاری ہوتی ہیں اور وہ نظم کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتی ہیں۔ بارہ ماسہ کی بڑی اہمیت و خصوصیت اس کی زبان ہے۔ چونکہ سارا بیان عورت کی زبان سے ہوتا ہے اس لیے اندازِ بیان پر بھی زنانی بولی کی چھاپ ہے۔ اس میں بڑا لوچ، نرمی اور رس ہے۔ جدائی کی حالتِ زار دکھانے لیے ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ بارہ ماسہ کی سلاست، روانی، سوز و گداز اور درد و اثر اپنی نوعیت میں یکتا ہے۔ شعراء نے باریک نفس بینی اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے اور ہجر و فراق اور رنج و الم کے سچے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

تاریخ و ارتقاء

بارہ ماسہ ہندی ادب کی صنفِ نظم ہے۔ سنسکرت میں یہ مفقود ہے۔ بارہ ماسہ کی تصنیف بارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کا کہنا ہے:

> "بارہ ماسہ کی ایک قدیم طرز خواجہ مسعود سعد سلمان کے دیوان فارسی میں ملتی ہے جو مروجۂ حال بارہ ماسہ کی اصل مانی جاسکتی ہے اور جسے وہ 'غزلیات شہوریہ' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بارہ فارسی مہینوں کے نام پر بارہ غزلیں لکھی گئی ہیں جو مختلف وزن اور ردیف وقافیہ میں ہیں۔ ہر غزل میں سات سات شعر ہیں۔

مطلعے میں التزاماً بارہ ماسے کی طرح مہینے کا نام آتا ہے۔ بعد کے اشعار موسمی کیفیت اور شراب کے ذکر سے شروع ہوتے ہیں اور بادشاہ کی مدح اور دعا پر ختم ہوتے ہیں . . . یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ خواجہ مسعود ایرانی شاعر نہیں ہیں بلکہ ہندوستانی ہیں . . . ان کی شاعری کا زمانہ (۴۶۹ھ سے ۵۱۵ھ) کے قریب ختم ہوتا ہے۔ ایران میں اس صنفِ نظم کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ اس لیے دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ خود خواجہ مسعود ہی اس صنف کے موجد ہیں۔ دوسری یہ کہ ان ایام میں اس قسم کی نظموں کا دیسی زبانوں میں رواج تھا . . . اس صورت میں خواجہ مقلد ہیں اور بارہ ماسہ بےحد قدیم ہے۔" ۱

"دستیاب شدہ بارہ ماسوں میں قدیم ترین بارہ ماسہ 'بارہناؤں' نامی ملتا ہے۔ جو، جن دھم سوای نامی ایک جین عالم نے بارھویں صدی کے وسط میں لکھا۔ دوسرا بارہ ماسہ بھی ایک جین عالم، و نے چند سوای کا لکھا ہوا 'نیمی ناتھ چنش پادکا' کے نام سے ملتا ہے۔ یہ ۱۲۹۵ء اور ۱۳۱۰ء کے درمیان کسی سال میں لکھا گیا۔ یہ بارہ ماسہ ساون سے شروع ہوکر اساڑھ تک پہنچتا ہے، اور لوند کا زائد مہینہ بھی اس میں شامل ہے۔ جبکہ دیوراسا کا بارہ ماسہ کاتک سے شروع ہوکر کنوار پر ختم ہوتا ہے۔ گن پتی کی 'مادھو مل

۱۔ حافظ محمود شیرانی: "مقالات حافظ محمود شیرانی"، جلد دوم، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۳۹۲-۳۸۹۔

کام کندلا' ۱۵۲۷ء میں بھی دو بارہ ماسے آتے ہیں۔
اور دونوں پھاگن سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ تمام
بارہ ماسے جائسی کی پدماوت (۹۴۷ھ/۱۵۴۱ء) سے
پہلے کے ہیں۔" ۱

اردو ادب میں ہندوی ادبی تصورات کا ماخذ جائسی کی پدماوت ہے۔ پدماوت کا سن تصنیف (۱۵۴۰ء) ہے۔ پدماوت ہندوی ادب کا ایک شاہکار ہے۔ اس میں قدیم ہندوی تصورات کی عکاسی ملتی ہے۔ جائسی ایک صوفی شاعر تھے۔ پدماوت کی ساری کہانی کو ایک تمثیل کہتے ہیں۔ پدماوت میں ناگ متی اور پدمنی دونوں پتی ورتا بیویوں کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ناگمتی کے بارہ ماسے میں جائسی نے ایک فراق زدہ عورت کا دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ پدماوت کے متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اردو میں اس کا ترجمہ عبرت و عشرت نے 'مثنوی شمع پروانہ' کے نام سے (۹۷-۱۸۹۶ء) میں کیا۔ ان تراجم سے قدیم مسلمان صوفی شعراء متاثر ہوئے اور بعد کے صوفی شعراء نے پدماوت کی تقلید میں بارہ ماسے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ "عثمان کی 'چترا ولی' (۱۶۱۳ء) نور محمد کی 'اندر اوتی' (۱۷۴۴ء) اور شیخ نثار کی 'یوسف زلیخا' (۱۷۹۰ء) میں بھی بارہ ماسے موجود ہیں۔" ۲

بارہ ماسے کا ذخیرہ دیسی زبانوں میں بھی ملتا ہے جن میں برج، اودھی، پنجابی، ہریانی اور اردو قابل ذکر ہیں۔ اردو میں بارہ ماسے کی عمر اردو نظم ہی کے ہمگ ہے۔

۱۔ ہرکاش مونس: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۰۸ء، ص ۶۲۰۔
۲۔ ایضا: ص ۶۲۰۔

پنجابی شاعری میں بھی بارہ ماسے کی روایت قدیم سے ملتی ہے۔ گرونانک (۱۴۶۹ء-۱۵۳۹ء) کے نکھاری راگ میں لکھے ہوئے بارہ ماسے میں بھی یہی رنگ ملتا ہے۔ گرو گرنتھ صاحب میں گرو ارجن دیو (۱۵۶۳-۱۶۰۶ء) کا صوفیانہ بارہ ماسہ ملتا ہے۔ پنجابی لوک گیتوں میں بھی ماہ بہ ماہ موسمی تبدیلیوں اور ان سے جذبات پر پڑنے والے اثرات کا مکمل خاکہ نظر آتا ہے۔ صوفی شاعر بلھے شاہ (۱۶۸۰-۱۷۵۳ء) کے یہاں تو یہ موسمی تبدیلیاں بھرپور آب و رنگ لیے ہوئے نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر مونس پرکاش کہتے ہیں: "اردو میں بارہ ماسے کی روایت کا 'چندائن' سے باقاعدہ آغاز ہوتا ہے"۔ ۱

مولانا داؤد کی 'چندائن' ۱۳۷۸ء میں لکھی گئی۔ یہ ڈلمئو ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ 'چندائن' کی زبان اودھی ہے لیکن اس کے تمام مخطوطے اردو رسم الخط میں ملتے ہیں۔ ہر بند کا عنوان فارسی میں ہے۔ یہ اس دور کی عام ادبی روایت تھی۔ اس بارہ ماسے میں مینا اپنی داستانِ فراق اپنے شوہر چندا تک پہنچانے کے لیے برہمن پیامبر کو سناتی ہے۔

بارہ ماسہ اپنی پوری آب و تاب اور اپنی مخصوص ادبی روایات لیے ہوئے افضل کی 'بکٹ کہانی' میں نظر آتا ہے۔ اردو ادب میں 'بکٹ کہانی' اولین مکمل بارہ ماسہ ہے جو ایک آزاد تصنیف کی حیثیت سے دستیاب ہے اور ہندی ادبی روایت کا آئینہ دار ہے۔ شمالی ہند کی ستر ہویں صدی کی اہم اور نمائندہ قابل قدر تصنیف ہے۔

۱۔ ڈاکٹر مونس پرکاش: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، دہلی، انجمن ترقیٔ اردو، ص ۶۲۲۔

محمد افضل بانی پتی (م ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء) نے اس بارہ ماسے سے شہرت دوام حاصل کی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ متعدد شعراء نے بکٹ کہانی کے طرز پر بارہ ماسے لکھے اور اعتراف بھی کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اکبر رھتکی قطبی کے تیرہ ماسے (۱۷۳۰ء) میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اکرم نے بکٹ کہانی اور افضل کا حوالہ یوں دیا ہے:

پریم قصہ ہوا ہے آخر یارو	تیرہ ماسا بھی اس کے تاں بچارو
بارہ ماسے ہوئے تھے اور سب کے	تیرہ ماسہ ہوا جا کر قطب کے
بکٹ افسانہ کا ہے یہ تو بھیا	دونوں کے تاں جنا ہے دوئی میا
اوسیں افضل کہ جس کا نانو گوپال	کہا ہے نارنولی صاحب حال
اسے قطبی کہ اکرم کر ہے مشہور	ز شعر و علم ہر دوہست معذور ۱۔

افضل کے بارے میں ایک اہم حوالہ عبداللہ انصاری کے بارہ ماسے میں ملتا ہے جو سنہ ۱۳۲۳ھ کی تصنیف ہے:

سراسر اہل عرفاں شاہ افضل	نہایت کامل و یکتا و اکمل
انھوں نے اک بکٹ لکھی کہانی	کیا جس میں بیاں سوز نہانی ۔۲

افضل کی 'بکٹ کہانی' کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے متعدد علماء و فضلاء نے اس پر تحقیق کی۔ ان میں پروفیسر محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر مسعود حسین، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر انصاراللہ نظر، ڈاکٹر عبدالجبار شکیل، ڈاکٹر محی الدین زور وغیرہ کے اسمائے گرامی سر فہرست ہیں۔ ان تمام محققین نے افضل اور ان کی بکٹ کہانی کے بارے میں غلط فہمیوں

۱۔ ایضاً: ص ۱۳۷۔

۲۔ ایضاً: ص ۱۴۰۔

کو دور کیا۔ تحقیقی مقالات میں افضل کے صحیح نام اور وطن کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور "آج تک کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ بکٹ کہانی کے مصنف کا نام گوپال۔ اس کا تخلص افضل اور اس کا وطن نارنول تھا"۔[۱]

'بکٹ کہانی' بارہ ماسے کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ اسے فراقیہ نظموں میں سرِ فہرست رکھا جا سکتا ہے۔ ایک ہجر کی ماری عورت کی بپتا نہایت دل گذار انداز میں بیان کی گئی ہے۔ پردیسی شوہر کی یاد میں اس کی بھوک، پیاس، نیند سب اڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے ہزار جتن کرتی ہے لیکن جب دل پر قابو نہیں رہتا تو بے ساختہ اپنی سہیلیوں کو اپنی بپتا سنانے لگتی ہے:

سنو سکھیو! بکٹ میری کہانی
بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھکو بھوک دن، نا نیند راتا
برہ کے درد سوں سونہ پراتا
ارے یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے
کہ جس کی آگ سے سب جگ جلا ہے
بکٹ مشکل نپٹ مشکل کہانی
دوانی کی سنو سکھیو کہانی

اس طرح قصے کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر مہینے میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ افضل ہجر و فراق کی کیفیات کو بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ غرض ساون ہو یا کاتک، ماگھ ہو یا پوس بارہ مہینوں کے فراقیہ جذبات کو مؤثر انداز میں شاعری کے

۱۔ ایضاً: ص ۱۴۶۔

سانچے میں ڈھالا ہے . . . بالآخر بارہ مہینوں کی آزمائش کے بعد اس کا پیتم لٹکتا آوتا ، ہے ۔ بے قرار ہوکر اس کے پاؤں پڑ جاتی ہے۔ پیا اس کو پکڑ کر گلے لگاتا ہے :

چہ مے بینم لٹکتا آوتا ہے
بہ حنش ماہ را شرماوتا ہے
اری میں دوڑ کے پاؤں پڑی جائے
پیا نے کر پکڑ لینی گلے لگائے

افضل کا بارہ ماسہ جذبات کے لحاظ سے ہندوستانی ہے۔ پروفیسر شیرانی کہتے ہیں :

"اس میں ہندوانہ زندگی کا مرقع پیش کیا گیا ہے حتیٰ کہ ہندو تہواروں ہولی ، دیوالی اور دسہرہ کا مع ان کے لوازمات کے مذکور ہے ۔ ہولی کے گیت گائے جاتے ہیں ۔ رنگ کی پچکاریاں ہاتھوں میں ہیں ۔ دف اور مردنگ بجائے جاتے ہیں۔ سر منڈل پھڑک رہا ہے ۔ گلال اور عبیر اڑایا جا رہا ہے ۔ دوہرے اور غزلیں گائی جاتی ہیں۔ کاگا قاصد ہے ۔ کوئل کوکتی ہے اور پپیہا پی پی کی پکار لگاتا ہے ۔ جوگن کا بھیس ، برہمن کی پوتھی دیکھنا ، ٹوٹکے کرنا وغیرہ تمام ہندی جذبات ہیں" ۔۱

بکٹ کہانی سے اس دور کی زبان و بیان کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے ۔ اس کے لسانی مطالعے سے ہم اس نتیجے پر

۱۔ حافظ محمود شیرانی : "پنجاب میں اردو" ، لاہور ، آئینۂ ادب ، ۱۹۷۲ء، ص ۲۰۷ ۔

پہنچتے ہیں کہ اب اردو آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ لے رہی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا بیان قابل توجہ ہے:

"بکٹ کہانی کے زبان و بیان میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں مختلف بولیوں کے اثرات نے مل جل کر اب اپنی ایک شکل بنالی ہے۔ یہ شکل دکنی اردو کے معیاری ادبی روپ سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش ہے۔ فارسی، عربی، ترکی زبانوں کے اثرات بھی ایک جان ہوکر زبان کے مزاج کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔" -۱

افضل کے بعد نصرتی کی 'گلشن عشق' سامنے آتی ہے۔ وہاں مدھومالتی چڑیا بن کر اپنی داستانِ فراق بارہ ماسے کی شکل میں بیان کرتی ہے۔" -۲

۱۷۳۰ء میں اکرم رہتکی تخلص قطبی نے بھی لوند کا مہینہ اضافہ کرکے ایک تیرہ ماسہ لکھا۔ محمود خاں شیرانی کہتے ہیں: "اکرم نے 'تیرہ ماسہ' یا 'پریم قصہ' بہ تتبع 'بارہ ماسہ' محمدافضل نارنولی تصنیف کیا ہے۔" -۳

"تیرا ماسہ بہ تتبع بارہ ماسہ قطبی کی ایجاد ہے۔ ان میں اسی قدر فرق ہے کہ بارہ ماسہ صرف بارہ مہینوں اور ان کے متعلقہ بارہ مہینوں کا ذکر ہوتا ہے۔ تیرا ماسہ

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، (حصہ اول)، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۶۹۔

۲۔ نصرتی: گلشنِ عشق مرتبہ مولوی عبدالحق،...

۳۔ حافظ محمود شیرانی: "مقالاتِ حافظ محمود شیرانی"، جلد دوم، محولہ بالا، ص ۳۸۶۔

میں لوند ۱۔ مہینہ بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ باقی
مراتب میں بارہ ماسہ اور تیرا ماسہ بالکل ایک ہیں۔" ۲۔

پروفیسر شیرانی کے اس خیال سے کہ تیرا ماسہ قطبی کی ایجاد ہے ڈاکٹر مونس پرکاش متفق نہیں۔ ان کا کہنا ہے:

"شیرانی صاحب کا یہ خیال درست نہیں۔ ہندی میں
تیرا ماسہ کہنے کا رواج اتنا ہی پرانا ہے جتنا بارہ ماسہ کا۔" ۳۔

ہم ان دونوں حوالوں کو سامنے رکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر شیرانی کا خیال بالکل صحیح ہے۔ ہندی ادب میں تیرا ماسے کی روایت یقیناً قدیم ہے لیکن اردو نظم میں قطبی کو تیرا ماسہ لکھنے میں اولیت حاصل ہے۔ قطبی کا تیرا ماسہ ۱۷۳۰ء کی تصنیف ہے۔

قطبی کا تیرا ماسہ آسان اور عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا وزن اور بحر وہی ہے جو افضل کی بکٹ کہانی کی ہے۔ قطبی افضل سے بے حد متاثر ہیں جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا ہے۔ تیرا ماسے کا تھیم تخیلاتی ہے۔ اس کہانی میں بھی کوئی نیاپن نہیں، اس دور کی بولی میں اسے نظم کر دیا گیا ہے۔ اسے سنوارنے اور شاعرانہ انداز بیان دینے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ یہ تیرہ ماسہ بھی صوفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے، اور صوفی الفاظ سے زیادہ معانی

۱۔ لوند یعنی ادھک ماسی: تیرھواں مہینہ جو ہر تیسرے سال کسرات جمع کرکے ہندو لوگ بڑھا لیتے ہیں۔

۲۔ حافظ محمود شیرانی: "مقالاتِ حافظ محمود شیرانی"، محولہ بالا، ص ۳۸۷۔

۳۔ ڈاکٹر پرکاش مونس: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، محولہ بالا، ص ۱۳۷۔

پر زور دیتے ہیں سو وہ ہمارے شاعر نے بھی کیا ہے۔ دوسرے یہ عہد اردو کے ارتقا کا ہے۔ ہریانی کی چھاپ اس تیرہ ماسے پر نظر آتی ہے۔ ابتدائی کوششوں کے لحاظ سے اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ شیرانی صاحب کہتے ہیں:

"دہلی کے قرب و جوار میں جو ابتدائی ادبی کوششیں ہو رہی تھیں ان میں اکرم کا یہ فراقیہ ایک خاص امتیاز کا مستحق ہے۔ وہ ایک ایسی تالیف ہے جس کی تاریخ تصنیف اور مصنف کے وطن سے ہم واقف ہیں۔"[۱]

تیرہ ماسے کا قصہ یوں ہے کہ شاعر محبوب کے فراق میں تیرہ مہینے گذار دیتا ہے۔ آخر تھک کر ایک جھونپڑی میں تصور یار میں محو رہنے لگا ہے اور بالآخر اس پر عشق حقیقی کے راز منکشف ہو جاتے ہیں۔

۱۷۲۸ء میں شاہ آیت‌اللہ جوہری نے 'مثنوی گوہر جوہری' تصنیف کی۔ اس میں افضل کی بکٹ کہانی کا پورا تتبع کیا۔ اس مثنوی کو بہار کی پہلی باضابطہ منظوم تصنیف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ ۱۳۳۵ ابیات پر محیط بارہ ماسہ ہے۔ جو اساڑھ سے شروع ہو کر جیٹھ پر ختم ہوتا ہے۔ بارہ ماسے کا انداز بیان بھی ہندوی بارہ ماسوں کا سا ہے۔ سال کے ہر ہر مہینے کا، اس کی خصوصیات اور تہواروں کے ساتھ بیان، ہندی استعارے، تلمیحات، تراکیب، عورت کی طرف سے جذبات کا اظہار، غرض ہندوی روایات کو پوری طرح برتا گیا ہے۔

۱۔ حافظ محمود شیرانی: "مقالات حافظ محمود شیرانی"، محولہ بالا، ص ۳۹۹۔

تیرھویں صدی ھجری کے اوائل میں ایک شاعر مقصود لکھنوی کا بارہ ماسہ ملتا ھے۔ اس پر بھی افضل کی بکٹ کہانی کے واضح اثرات نظر آتے ھیں۔

'اردو مثنوی کا ارتقا' میں پروفیسر عبدالقادر سروری، عبدالولی عزلت کے بارہ ماسے کا ذکر کرتے ھیں۔ عزلت، میر تقی میر(۱۸۰۱ء) کے ھم عصر تھے۔

فورٹ ولیم کالج میں کاظم علی جوان نے بھی ایک بارہ ماسہ تصنیف کیا۔ صاحبِ 'اربابِ نثرِ اردو' نے اس کا سالِ تصنیف ۱۸۱۲ء دیا ھے۔ ۱

محمد عتیق صدیقی نے اپنی تصنیف 'گلکرسٹ اور اس کا عہد' میں حیدری کی ایک تصنیف کا نام بھی بارہ ماسہ دیا ھے۔ ۲

انیسویں صدی کے اوائل میں مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی کا بارہ ماسہ 'بکٹ کہانی' کے عنوان سے سامنے آتا ھے۔ اس وقت جو نسخہ ھمارے پیش نظر ھے وہ مطبع نولکشور واقع کانپور سے ۱۸۸۴ء میں چھپ کر سامنے آیا ھے۔ اس بکٹ کہانی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ھوتا ھے کہ اس کے سات ایڈیشن اب تک آچکے ھیں۔ مفتی صاحب مستند عالم دین اور صوفی تھے۔ یہ بکٹ کہانی بھی تصوف سے شرابور ھے اور افضل کی بکٹ کہانی سے بےحد متاثر ھے۔ لیکن اس کا موضوع عشق مجازی نہیں بلکہ عشق حقیقی ھے۔ جیسا کہ

۱۔ سید محمد: "اربابِ نثر اردو"، طبع دوم، حیدرآباد دکن، مکتبہ ابراھیمیہ، ۱۹۲۷ء، ص ۱۹۲۔

۲۔ محمد عتیق صدیقی: "گلکرسٹ اور اس کا عہد"، علیگڑھ، انجمن ترقیٔ اردو ھند، ۱۹۶۱ء، ص ۲۲۵۔

قبل ازیں عرض کیا گیا تھا کہ بارہ ماسے میں تصوف کی لہر جائسی کی بدولت سے آئی اور صوفی شعراء نے اپنی مثنویوں میں بارہ ماسے کی روایت کو کشادہ دلی سے قبول کیا۔ سہیل بخاری کا کہنا ہے :

"اس قصے میں یعنی 'چندائن' میں ملا داؤد نے تمثیل کا سہارا لے کر صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تمثیلوں کے ذریعے تصوف کے اسرار و رموز بیان کرنے کی ابتدا غالباً ملا داؤد کے ہاتھوں ہوئی"۔[۱]

مفتی صاحب کے سامنے افضل کا بارہ ماسہ رہا ہے۔ اس نظم کے تاثر ہی نے ہان سے بکٹ کہانی تخلیق کرائی۔ اس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا ہے :

سنی ہوگی بکٹ تم نے کہانی
سب اوس کے خام کی آتش فشانی
ولیکن میں جو دیکھا اوس کو سارا
طبعیت نے مری اک جوش مارا
یہ آیا دل میں کہیے اک کہانی
بیاں ہو جس میں سوزِ دل نہانی

اس بکٹ کہانی سے مفتی صاحب کی تخلیقی و ادبی صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ سطور میں اس بکٹ کہانی کا مفصل جائزہ پیش کیا جائے گا۔

گارسیں دتاسی کے خطبات میں بھی بعض اردو بارہ ماسوں کے نام آتے ہیں۔ دتاسی کا دستور تھا کہ وہ سال کے آخر میں اپنے

۱- سہیل بخاری : "ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ"، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۵ء، ص ۲۹۔

خطبوں میں اس سال کی مطبوعہ کتابوں کے نام دیا کرتے تھے۔ اس سے ان کے سالِ طبع کا پتا چل جاتا تھا۔ ان خطبات میں بعض بارہ ماسوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ۱۸۶۵ء میں کرشن کا بارہ ماسہ، ۱۸۶۶ء میں خیرا شاہ کا بارہ ماسہ، ۱۸۷۲ء میں برہ ماسا اور ۱۸۷۷ میں عطا بخش کے بارہ ماسے کا ذکر آتا ہے۔[۱] صوفی شعرا نے بارہ ماسوں میں تصوف کی جو لہر چلائی تھی۔ اس ضمن میں طالب شاہ کا تیرہ ماسہ 'مثنوی رموز العاشقین معروف بہ تیرہ ماسہ طالب شاہ' کے نام سے سامنے آتا ہے۔ اس تیرہ ماسے کے آخر میں کئی قطعاتِ تاریخ تصنیف ہیں جن سے (۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) برآمد ہوتا ہے۔ یہ تیرہ ماسہ اساڑھ سے شروع ہوکر جیٹھ اور لونڈ کے مہینے پر ختم ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں انشاء اللہ اس کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ ڈاکٹر مونس پرکاش اپنی کتاب 'اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر' میں کہتے ہیں: "بارہ ماسوں کی روایت میں ایک مکمل اور آزاد کتاب کی صورت میں طالب کا تیرہ ماسہ آخری ادبی تصنیف نظر آتی ہے"۔[۲]

موجودہ تحقیق کے مطابق اردو بارہ ماسوں میں عبداللہ انصاری کا بارہ ماسہ ربانی آخری بارہ ماسہ ہے۔ "اس بارہ ماسے کا سال تکمیل ۱۳۲۳ھ ہے"۔[۳]

۱۔ گارساں دتاسی: "خطبات گارساں دتاسی"، حصہ اول، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ص ۱۶۹ - ۲۶۸ - (حصہ دوم، ص ۴۳)

۲۔ ڈاکٹر مونس پرکاش: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، محولہ بالا، ص ۶۳۲۔

۳۔ ڈاکٹر تنویر علوی: "اردو میں بارہ ماسے کی روایت: مطالعہ و متن"، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۵۔

ڈاکٹر مونس پرکاش اس کا سالِ تصنیف ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے حوالے سے ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء بتاتے ہیں۔۱ یہ غلط فہمی یا الجھن مخطوطے کے ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ بارہ ماسہ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کی فرمائش پر نہیں بلکہ ان کی اور افضل کی ہکٹ کہانی سے متاثر ہوکر عبداللہ انصاری نے تحریر کیا۔ سببِ تالیف چونکہ بارہ ماسے کے آخری صفحات میں ہے اور اس ذیل میں ۵۳ اشعار آتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب کو مکمل دستیاب نہ ہوسکے۔ اس بنا پر انھیں یہ خیال ہوا کہ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور عبداللہ انصاری ہم عصر ہیں۔ حالانکہ بعدِ زمانی ایک صدی پر محیط ہے اب ہم سببِ تصنیف سے چند اشعار پیش کرتے ہیں تاکہ مکمل طور سے اشتباہ دور ہوسکے۔ اس ذیل میں ۵۳ اشعار ہیں:

سراپا اہل عرفاں شاد افضل
نہایت کامل و یکتا و اکمل
اونہوں نے اک ہکٹ لکھی کہانی
کیا جس میں بیاں سوز نہانی
زنانی بولی ہے اس کی پیاری
جسے سن کر ہو دل میں بے قراری
الٰہی بخش مفتیٔ یگانہ
رئیس کاندھلہ فخرِ زمانہ
وہ عالم باعمل تھے اور عارف
بڑے کامل تھے اور صاحب معارف

۱۔ ڈاکٹر مونس پرکاش: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، محولہ بالا، ص ۶۲۶۔

شہ عبدالعزیز دہلوی کے
تھے شاگرد اور نہایت متقی تھے
جو دیکھی مفتی صاحب نے کہانی
لگی ان کو بہت ہی وہ سہانی
پھر ہاجب اوس کو اک دل پر لگی چوٹ
اثر سے اوس کے ان کا دل گیا ٹوٹ
اونھوں نے بھی کیا غم نامہ تحریر
ہکٹ کی کھینچ دی گویا کہ تصویر
جو دیکھا میں نے اوس کا طرز پیارا
طبیعت نے مری اک جوش مارا

اسی سببِ تصنیف میں عبداللہ انصاری نے اپنے پیر حاجی امداد اللہ انصاری مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) کا ذکر بھی نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔

یہ بارہ ماسہ بھی مکمل طور پر فراقیہ نظم ہے۔ اس کا اصل موضوع بھی عشقِ مجازی نہیں بلکہ عشق حقیقی ہے۔ جگہ جگہ اشعار کے نیچے حاشیے پر مجازی استعاروں کے حقیقی معنی دیے ہیں اور مکمل طور پر تمثیلی رنگ چھایا ہوا ہے۔ اس بارہ ماسے پر ہندوی کا بڑا گہرا اثر ہے۔ ایک ہجر کی ماری ہوئی عورت کے جذبات پوری طرح اس میں سمودیے گئے ہیں۔ زبان بھی نسائیت لیے ہوئے ہے۔ بارہ ماسے کے مخصوص تصورات اس میں مکمل طور پر سمودیے گئے ہیں۔ عبداللہ انصاری کا بارہ ماسہ اساڑھ سے شروع ہوتا ہے۔ متفرق اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اساڑھ آیا مجھے دکھ سہتے سہتے ہوئے پٹ نین آنسو بہتے بہتے
سکھی اس رت میں بجلی جو کڑکے پیا بن دل مرا بے طور دھڑکے
سکھی جب سے گیا ہے میرا گوکل نہیں ہے رات دن بس جان کو کل

ساون :

کرے ہی ہی پپیہا ساون آیا مگر اب تک سکھی ساجن نہ آیا
سکھی سب ناریاں تیجیں نہائیں وہ مل کے گائیں اور کھیلیں کھلائیں
غم فرقت سے میں تو گھل گئی ری کنول کے ڈھونڈنے میں رل گئی ری

جیٹھ :

مہینہ جیٹھ کا آیا سکھی ری مری محنت ٹھکانے اب لگی ری
دعا کرتی ہوں دل سے اب اوٹھا ہاتھ رہے دونوں جہاں میں پی مرے ساتھ
کہو تم سکھیو اس پر آمین اللہ مری ہے التجا تم سے یہ للہ

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ انصاری نے ہندی روایات کو پوری طرح برتا ہے۔ ان کا بارہ ماسہ اردو میں آخری ادبی بارہ ماسہ ہے۔

بارہ ماسے کی تاریخ اور ارتقا کے جائزے کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور مفتی الٰہی بخش نشاط کی بکٹ کہانی اور 'طالب کے تیرہ ماسے' کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

(۲)

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کی 'بکٹ کہانی':

مفتی الٰہی بخش کاندھلہ کے ایک قدیم علمی گھرانے کے فرد تھے (۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ اپنی ساری زندگی علم و تحقیق، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے ممتاز شاگرد تھے اور شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی

کے ہم درس تھے۔ مفتی صاحب نظم و نثر، قوتِ تحریر اور حسنِ انشا میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کی تحریریں برجستگی و بدیہہ گوئی اور قلم کی روانی کی اچھی مثال ہیں۔

نورالحسن راشد اپنے مضمون 'فہرست مخطوطاتِ اردو مفتی الٰہی بخش اکادمی کاندھلہ' مطبوعہ خدا بخش لائبریری جرنل (۴۷) ۱۹۸۸ء میں لکھتے ہیں:

> "مفتی صاحب نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں تصنیفات و تالیفات، شرح و تراجم اور تلخیصات کا ایک وسیع ذخیرہ یادگار چھوڑا ... معلوم تصنیفات میں سے تیس عربی، پچاس فارسی اور چھے اردو میں ہیں ... مقبول کتابوں میں سیرت کے موضوع پر 'شمیم الحبیب' اور سلوک و ادب کے موضوع پر مشترکہ یادگار بکٹ کہانی شامل ہیں۔ جملہ کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت اختتام مثنوی مولانا روم کو حاصل ہوئی ... جو (۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء) میں وجود میں آئی۔" ۱

مفتی صاحب کا ذوقِ سخن تعارف کا محتاج نہیں۔ مفتی صاحب نشاط تخلص کرتے تھے۔ متعدد تذکرہ نگاروں نے مفتی صاحب کے ذوقِ شعر گوئی کا تذکرہ کیا ہے۔ چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔ گلشن ہمیشہ بہار، گلستانِ بے خزاں، طبقات الشعرا ہند۔ اس کے علاوہ بھی بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں مفتی صاحب کا ذکر ملتا ہے۔ گلشن بے خار میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کہتے ہیں:

۱۔ نورالحسن رشد: "فہرست مخطوطاتِ اردو، مفتی الٰہی بخش اکادمی، کاندھلہ"، مشمولہ خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ ۴۷، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۱۔

"نشاط تخلص مولوی الٰہی بخش۔ از اہل علم و دانش است۔ خانہ در قصبہ کاندھلہ دارد۔ کسبِ فنونِ علمی از خدمتِ مولانا عبدالعزیز صاحب طاب ثراہ نمودہ و امتیاز تمام یافتہ۔ لاسیما فقیہ بے عدیل است۔

تیغ ابرو کا اگر کچھ بھی اشارہ ہوجائے
آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہوجائے۔" ۱

خویشگی نصراللہ خاں اپنے تذکرے "گلشن ہمیشہ بہار" میں مفتی صاحب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"نشاط تخلص۔ مولوی الٰہی بخش عارف مقبول بارگاہ حضرت اللہ العلی مدرس و عالم بے نظیر۔ فاضل دلپذیر، صوفی صافی و ہرچہ گویم بوصفش غیر کافی یعنی مولوی الٰہی بخش کاندھلوی را حصولِ علومِ درسیہ از خدمتِ مولانا شاہ عبدالعزیز رضی اللہ عنہا نمودہ و زر معنوی از بطونِ برادرِ خورد بودہ گویند کہ او را دربیسار مے خواند اد نائے او این است کہ سوائے درس وعظ و تصنیف کتبِ انشاء، انشاء شعر تحریر افتا۔ ۔ ۔ و دیگرے از ثقات شنیدہ ام وھم دیدہ کہ مولانا ممدوح دفترِ ھفتمین از مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ بحسب ارشادِ باطنی آں بزرگ تصنیف فرمودہ اند و دفترِ اولین مثنوی معنوی ترجمہ اللفظ بہندی، نمودہ اند و کلامے چند ازاں

۱۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ: "گلشنِ بے خار"، مرتبہ کلب علی خاں، طبعِ اول، لاہور، مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۷۳ء، ص ۶۲۰۔

بزرگ می نگارم بہ سمع دل باید شنید کہ فکر عالی داشت . . . ۔" ۱

عبدالغفور نساخ اپنے تذکرے 'سخنِ شعرا' میں مفتی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :

"نشاط تخلص، مولوی الٰہی بخش کاندھلہ، فقیہہ بے بدل تھے ۔ دھلی میں مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی خدمت میں تحصیل علم کی تھی۔" ۲

مفتی الٰہی بخش نشاط کا شمار شاہ عبدالعزیز صاحب کے ان باکمال تلامذہ میں کیا جاتا ہے ۔ جن سے حدیث کے درس کے حلقے قائم ہوئے اور حدیث کے دوسرے شیوخ اور اساتذہ پیدا ہوئے ۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ وہ مولوی الٰہی بخش کو تیرھویں صدی کے باکمال اور مشاہیر رجال میں شمار کرتے ہیں ۔ مولانا اپنی تصنیف 'تاریخِ دعوت و عزیمت' میں رقم طراز ہیں :

"حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس و تربیت و صحبت سے جن علماء نے فائدہ اٹھایا اور پھر اپنا حلقۂ درس قائم کر کے سارے ہندوستان میں نام پیدا کیا اور دینی نظامِ تعلیم میں زندگی کی نئی روح پھونک دی پھر خود ان کے درس کے فیض سے کثیرالتعداد جید علماء تیار ہو کر نکلے ۔ ان میں سے چند کے نام یہاں

۱۔ نصراللہ خاں خویشگی: "گلشن ہمیشہ بہار" (مرتبہ اسلم فرخی)، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۶ ۔

۲۔ عبدالغفور نساخ: "سخن شعرا"، لکھنؤ، اتر پردیش اکادمی، ۱۹۸۲ء، ص ۵۲۱ ۔

لکھے جاتے ہیں۔ جو اپنی قوت و ملکۂ تدریس، منقول و معقول کی جامعیت اور تبحرِ علمی میں مشہور و مسلم تھے اور جو اپنی جگہ خود ایک مدرسہ اور دبستان تھے۔ (۱) مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۲) مولانا امام الدین دہلوی وغیرہ۔" ۱

اسی تصنیف میں مزید دو مقامات پر مفتی صاحب کا ذکر ملتا ہے۔ ۲

اپنی ایک اور معرکتہ الآرا تصنیف سیرت سید احمد شہید، میں مفتی الٰہی بخش کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"کاندھلہ میں مفتی الٰہی بخش صاحب جو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نامور شاگرد اور مرید تھے۔ سید صاحب سے بیعت ہوئے اور ان کے قصبے کے اکثر اہل علم اور شرفا بیعت ہوئے۔" ۳

سید احمد شہید نے دوآبہ کا دورہ (۱۲۳۴ھ) میں کیا تھا۔ مفتی صاحب اس دورے میں ان کے ہمراہ تھے۔ اسی ذکر میں ضمناً مفتی صاحب کی ایک اہم تصنیف 'ملہمات احمدیہ' کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے ایک طرف ان کی بیعت کی تاریخ کا علم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوآبے کے سفر کے دوران 'صراطِ مستقیم' کی تلخیص کا خیال بھی پیدا ہوا۔

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ پنجم، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۴ء، ص ۳۸۱۔

۲۔ ایضاً: ص ۳۵۸-۳۴۸۔

۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: "سیرت سید احمد شہید"، حصہ اول، لکھنؤ، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۹۔

اسی تالیف میں مولوی الہٰی بخش نشاط کے صاحبزادوں کے بیعت ہونے کا ذکر ہے:

"مراد نگر میں مولوی ابوالقاسم، مفتی الہٰی بخش کاندھلوی کے صاحبزادے، جو وہاں تھانیدار تھے، برقندازوں کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوئے، مولوی ابوالقاسم نے دعوت کی اور تمام برقنداز بیعت سے مشرف ہوئے۔" ۱

اسی کتاب کے حاشیے پر مفتی الہٰی بخش مرحوم کے صاحبزادے مولانا ابوالحسن متخلص بہ حسن، مصنف مثنوی 'گلزارِ ابراہیم' (م ۱۲۶۹ھ) کا ذکر بھی ہے۔ ۲

گارساں دتاسی نے بھی اپنے خطبات حصہ دوم میں مفتی صاحب کا ذکر کیا ہے:

"میں اردو کتابوں کے ذکر کو بغیر مولوی جلال الدین رومی کی 'مثنوی معنوی' کی نسبت کچھ کہے بغیر ختم نہیں کروں گا۔ محمد کریم الدین نے مجھے از راہِ کرم اس کا نظم میں اردو ترجمہ مخطوطے کی حالت میں بھیجا ہے... ترجمہ مولوی الہٰی بخش نشاط اور مولوی ابوالحسن نے کیا ہے۔ ترجمے کا نام 'مجمع فیض العلوم' رکھا ہے۔ بمبئی میں ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ تا ۱۸۲۸ء) میں جو عمدہ فارسی ایڈیشن طبع ہوا تھا غالباً اس کو ترجمے میں پیش نظر رکھا گیا ہے۔" ۳

۱۔ ایضاً: ص ۱۶۱۔

۲۔ ایضاً: ص ۱۷۹۔

۳۔ گارساں دتاسی: "خطبات گارساں دتاسی"، حصہ دوم، محولہ بالا، ص ۴۰۔

نورالحسن راشد نے اپنے مضمون 'فہرست مخطوطات اردو مفتی الٰہی بخش اکادمی کاندھلہ' میں جو فہرست' مخطوطات کی دی ہے اس میں بھی ابوالحسن کی 'مثنوی گلزار ابراہیم' اور 'مثنوی بحرالحقیقت' کی موجودگی کا ذکر صفحہ ۱۸۵ پر کیا ہے۔

بکٹ کہانی کے ایک مطبوعہ نسخے کا تعارف :-

اس کا ایک ہی مطبوعہ نسخہ ہم تک پہنچا ہے جس کے خاتمہ' تحریر میں یہ عبارت درج ہے۔

"الحمد اللہ کہ کتاب 'بکٹ کہانی' تصنیف مولوی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کی ماہ جنوری ۱۸۸۴ء کو مطبع فیض منبع منشی نولکشور صاحب واقع کانپور میں چھپی۔"

نورالحسن راشد کے مطبوعہ مضمون 'فہرست مخطوطات اردو، مفتی الٰہی بخش اکادمی کاندھلہ' سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کے سات ایڈیشن نکلے تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب پہلی بار چھپنے کے بعد خاصی مقبول رہی ہے۔ اس کا کوئی قلمی نسخہ ہماری معلومات کی حد تک کسی ذخیرۂ مخطوطات میں موجود نہیں، حتیٰ کہ خود مصنف کی ان کتابوں میں بھی شامل نہیں جو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ کر مفتی الٰہی بخش اکادمی کاندھلہ میں موجود ہیں۔ جیسا کہ خدا بخش لائبریری جرنل میں شائع شدہ فہرست سے پتا چلتا ہے۔ ۱

اب ذیل میں اس کہانی کے مشمولات کا ایک تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں حمد و نعت اور مصنف کے دعائیہ

۱۔ نورالحسن راشد : "فہرست مخطوطات اردو مفتی الٰہی بخش اکادمی کاندھلہ"، محولہ بالا، ص ۱۷۱۔

ابیات آتے ہیں۔ بارہ ماسہ حمد کے چار اشعار سے شروع ہوتا ہے۔ ان میں شاعر وصفِ خداوندی بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کن کہا اور دنیا وجود میں آگئی اور اسی خداوند عالم نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور انسان کے دل میں اپنی محبت کا بیج بویا اور دل میں تڑپ پیدا کی۔

اس کے بعد نعت کے اشعار ہیں۔ جن کی تعداد ۲۳ ہے۔ ان میں شاعر اپنی بے کسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور وسیلے کے بغیر حمد خدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں جہان کی پیدائش کا سبب ہیں۔ آپ محبوبِ رب ہیں۔ آپ نبوت کے معراج ہیں۔ آپ شافعِ محشر ہیں۔ آپ گناہ گاروں کے یار ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے اور ان کا کرم شاملِ حال نہ ہوتا تو ہم سیاہ رو کہاں جاتے۔ شاعر حضور صلعم کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ قیامت کے دن سب کے اعمال سامنے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ سب نیک و بد کو پوچھے گا اور تمام بندے جزا و سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ میں اس دن کے لیے پریشان ہوں جب کوئی کسی کو نہ پہچانے گا۔ آپ ہی شفاعت فرمائیے، آپ ہی کا آسرا ہے۔ امت کا جہاز آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اپنے کرم سے امت کو بچا لیجیے اور مجھ ناچیز کو بھی اپنی شفاعت سے محروم نہ کیجیے۔ حمد و نعت اور دعائیہ ابیات خاص مولوی الٰہی بخش نشاط کا اضافہ ہے۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے آغازِ مثنوی کی اسلامی روایات کو بارہ ماسہ میں داخل کیا۔

اس کے بعد حکایتِ حال کے عنوان سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تمہید میں وہ ہندی شاعری کی روایت کے مطابق برہ کی

ماری عورت کا حال اس کی زبانی یوں شروع کرتے ھیں۔ قبل ازیں ھم نے عرض کیا تھا کہ دیگر بارہ ماسوں سے مفتی صاحب کے بارہ ماسہ کا واضح فرق یہ ھے کہ یہ فراقیہ نظم عارفانہ رنگ لیے ھوئے ھے۔ اس کا اصل موضوع عشق مجازی نہیں بلکہ عشقِ حقیقی ھے۔ پیا اصل میں خدا تعالیٰ کا نام ھے اور زنِ مہجور خود شاعر ھے اس پر مکمل طور حقیقی رنگ چھاپا ھوا ھے۔ مگر صوفیانہ رنگ کے باوجود اس بارہ ماسے پر ھندی بارہ ماسے کا بڑا اثر ھے۔

اس تمہید کے بعد بارہ مہینوں کا حال پیش کیا جاتا ھے۔ جیسا کہ بارہ ماسوں کا قاعدہ ھے کہ وہ ان مہینوں کے حال میں موسموں کی کیفیات پیشِ نظر رکھتے ھیں۔ عورت کے جذبات و احساسات میں جونشیب و فراز پیدا ھوتا ھے انھی کا بیان بارہ ماسے کا مخصوص موضوع ھے۔

حکایاتِ حال کے عنوان سے مفتی صاحب ھجر زدہ عورت کے جذبات کی عکاسی کرتے ھیں جس کا شوھر پردیس جا رھا ھے۔ وہ اس کی منت و خوشامد کرتی ھے کہ اسے اکیلا چھوڑ کر نہ جائے مگر برہ کی ماری کی اس نے ایک نہ منی اور پردیس سدھار گیا:

کیا اپنا سفر مجھ چھوڑ اکیلی
مری سب کل برہ نے آج لیلی
دکھاؤں فال پی کے آونے کی
پڑھوں منتر میں اوس کے لاونے کی
نویا نسدن شگن اوڑھ کر مناؤں
جتن سیتی کسی میں پی کو پاؤں

دیہات و قصبات میں آج بھی توھم پرستانہ ماحول ھے۔ عورتیں مقابلۃً زیادہ ضعیف الاعتقاد ھوتی ھیں۔ ذیل میں درج اشعار بھی واضح

طور پر ہندی شاعری کا اثر ظاہر کر رہے ہیں۔ ہجر کی ماری گھبرا کر کبھی فال نکلوانے کا سوچتی ہے، کبھی کوئی منتر پڑھتی ہے، کبھی شگن لیتی ہے کہ شاید اس طرح پردیسی کی کوئی خبر ملے۔ آخر دکھ سہتے سہتے اساڑھ کا مہینہ آجاتا ہے:

تجوں گی تم بنا سنگھار اپنا؟
رہوں گی میں سجن من مار اپنا
پیا تم بن میں کاجل کب کروں گی
لباس اپنا میں بالم سب دھروں گی

بارہ ماسے کی روایت کے مطابق شوہر کی جدائی کے زمانے میں عورت اپنا آپا بھول جاتی ہے۔ نہ اسے کنگھی چوٹی کا ہوش رہتا ہے نہ کپڑے بدلنے کا۔ اس کا سنگھار پٹار سب اس کے شوہر کے دم سے ہے۔ جب وہ نہیں تو کس کے لیے سجے سنوارے۔ یہ حقیقت صرف بارہ ماسے تک محدود نہیں بلکہ مشرقی خواتین کا طرۂ امتیاز ہے۔ شوہر ان کے سر کا تاج ہے اور گھر پر حکمرانی شوہر ہی کے دم سے ہے۔

اسی تنہائی اور بے کسی میں ساون کا مہینہ آجاتا ہے اور برہنی کی آتش فراق شدت اختیار کر لیتی ہے:

گھٹا ہر طرف سے امڈی کھڑی ری
اٹاری میں لگی دیکھوں پڑی ری
امنڈ کر لال بادل آوتے ہیں
برہ کی آگ دل میں لاوتے ہیں
اری جب مور بن سے کوکتا ہے
مرا آواز سن جی سوکتا ہے

اری جب کوک کوئل کی سنائی
تمامی تن بدن میں آگ لائی
ھنڈولے جھولتی ھیں سب سکھی ری
پھروں میں ڈھونڈ تی در بدر ری
سجن بن سیج مجھ کو ڈاکنی ھے
اندھیری رین کالی ناگنی ھے
ھمیشہ منتظر پی کی رھوں میں
نذر پیروں کی دم دم میں کھوں میں

ٹھنڈی ھوائیں امنڈتے بادل رم جھم برستی پھواریں سب اس کے آتش فراق کو بڑھا دیتی ھیں جب سکھیوں کو جھولا جھولتے دیکھتی ھے تو حسرت ویاس میں اور بھی اضافہ ھو جاتا ھے۔ حتیٰ کہ وہ پیروں کی نذر ماننا شروع کر دیتی ھے۔ عورت ھے اور کمزور ھے اس کے بس میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہ وہ اپنی مراد پوری ھونے کے واسطے ولیوں پیروں کا سہارا لے۔

غرض غم سہتے اور جدائی برداشت کرتے کرتے بھادوں آگیا۔ اور اس کے تن بدن میں ایک نئی آگ لگا گیا :

آیا بھادوں مجھے ترساؤتا ھے
گھٹا غم کی سکھی برساؤتا ھے
اندھیری رین میں چمکے ھے جگنوں
نپٹ ھوتی ھوں میں بے جان مجنوں
اری اس رات کے روشن ستارے
مری لیکھے تو ھیں انگارے سارے
پر افشاں جا کہیں اب تو شنابی
سجن سے کہہ مرے دل کی خرابی

پیا پردیس کیوں تم نے بسایا
عبث مجھ برھنی کو کیوں جلایا
ارے کس نے تجھے اس لے لیا ہے
جیادھن اور اوسکا جس نے تو لیا ہے

پیا کے بغیر اسے ستارے بھی انگارے لگتے ہیں۔ جگنو کی چمک اسے ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ وہ بار بار خیال کرتی ہے کہ پردیس میں اس کا سجن رس بس گیا ہے اور کسی اور عورت نے اسے رجھالیا ہے۔ عورت کے لیے جدائی تو بہرصورت اک عذاب ہے لیکن سوکن کا تصور تو اس کی پوری ہستی کو پھونک رہا ہے۔ تنہائی کی گھڑیاں گزارتے کنوار کا مہینہ آگیا مگر نہ پی آیا نہ اس کا خط پتر۔ ملاحظہ کیجیے کس طرح نشاط نے زنانی بولی کو بارہ ماسے میں برتا ہے اور عورت کے جذبات کی کیسی سچی عکاسی کی ہے:

پیا کے آونے کا دن نہ آیا
بہت تعویذ اور منتر پڑھایا
نکالوں فال اور رمّال ڈھونڈوں
ہر ایک سے پی کی اپنی بات پوچھوں
سبھی سکھیاں پیا بن جھولتی ہیں
خوشی سوتی کنا کت بوجتی ہیں
ہنسیں کھیلیں خوشی ہو نار ساری
بلاویں مجکو سب گھر باری باری
کسی سے خاک کیا ہنس کے کہوں میں
جدائی کی اگن میں نت جروں میں

ہجر کی ماری ہوئی دکھیا کیسے فریاد کرتی ہے۔ حتیٰ کہ تعویذ گنڈوں پر اتر آئی ہے۔ کبھی فال نکلواتی ہے اور کبھی رمّال

سے اپنے پردیسی کا حال پوچھتی ہے۔ اس کی سکھیاں خوشیاں منا رہی ہیں۔ جھولا جھول رہی ہیں اور کناگت کا تہوار گنگا اور جمنا میں نہا کر منا رہی ہیں۔ ایسے خوشی بھرے لمحات میں کیا بتائے کہ جدائی کی آگ نے اسکو کیسا کیسا جلایا ہے۔ انتظار میں کاتک کا مہینہ آگیا مگر نہ پیتم آیا نہ اس کی کوئی خیر خبر آئی:

کریں گھر گھر چراغاں سب لگائی
ہمیں سی برھنی کی سدھ نہ آئی
جلوں میں دیکھ جاتی دیوری رے
بساری مینے ساری پیونی رے
چراغونسے ہوئی ہے رات تو دن
مری لیکھے اندھیری ہے سجن بن
سکھی ری پوجتی پھر کیا دسہرا
سنو سب نار نے خوش بھیس پہرا

دسہرہ آگیا۔ سکھیاں جشن منا رہی ہیں گھر گھر چراغاں ہے مگر ہجرزدہ کی قسمت میں اندھیرا ہی لکھا ہے۔ مفتی صاحب نے ہندوانہ تہواروں کی صحیح تصویر پیش کردی ہے۔ چاندنی بھی ناگن بن کر ڈس رہی ہے۔ پیا کے بغیر یہ راتیں کیسے گزارے۔ اب تو اگھن کا مہینہ آگیا مگر پیا کی طرف سے بے خبری نے اس کی جان آدھی کردی اپنی ساتھنوں سے کہتی ہے:

اگر دوگے کسیکو تم دل اپنا
تبھی جانوگے میرے دل کا سپنا
پرائی پیر جب جانو سکھی رے
تمہارا ہو جدا بالم کبھی رے
اکیلی میں رہی روتی پیا بن
پھروں قمری سی نالاں رات اوردن

بارہ ماسہ کا اساسی مضمون ہجر و فراق ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں جب برہنی اپنے اپنے کا غم کا اظہار نہ کر رہی ہو۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ نشاط کے یہاں جذبات میں ارتعاش و انفعال کا نقش بھی اسی کی مطابقت اختیار کر لیتا ہے۔ ماہ پوس کا بیان دیکھیے :

سکھی جاڑے میں سکھ کرتی ہیں ساری
ہمیں سی برہنی پھرتی ہیں نیاری
اجی پھولوں بھری یہ سیج میری
ہمارے بن کٹھن دکھ مجھ کو دے ری
کہیں روٹھا ہے کیا وہ مجھ دکھی سے
جو گھر آتا نہیں جی کی خوشی سے
اری سکھیو تمہیں اتنا کرو ری
ہمارے سے یہ ٹک جا کر کہو ری
کہ اے ظالم چل اپنے گھر سویرے
موئی وہ برہنی ہجراں میں تیرے
خطا گر اوسنے کی ہے بخش دیجو
تپٹ بیتاب ہے ٹک رحم کیجیو

برہنی اب منت سماجت پر اتر آتی ہے۔ سہیلیوں کو وسیلہ بنا کر ساجن کو پیغام بھیجتی ہے کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو اسے معاف کردے۔ یہ خالصۃً نسائی انداز فکر ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مفتی صاحب جیسا عالم دین اور اتنا جذباتی اندازِ فکر۔ کیسی صحیح اور سچی جذباتی تصویر کھینچ دی ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق چونکہ شاعر خود ہی زنِ مہجور ہے اور بیا اللہ تعالیٰ، اسی لیے ان اشعار میں نیا کیف و رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ہجر و فراق سہتے اب ماگھ کا مہینہ آگیا، مگر اس کے دل کی کلی نہ کھلی:

پھروں گھر گھر سدا میں فال لیتی
سبھی باھمن جتی میں بوج بیٹھی
کہوں اے کاک اوڑ جو پی گھر آوے
ترے قربان جی جو دلبر آوے
سدا میں کاک کوٹھی پر اوڑاؤں
پیارے کو کبھی تو میں بھی پاؤں
ارے اے شوق جا تو ھی پیا کن
خبر لادے کہ کیوں آئے نہ ساجن
ارے اے شوق قاصد مجھ دکھی کے
لگے گی دیر خط لکھنے میں پی کے
کلیجا ھی مرا لے جا پیاپا
غرض جس طور ھو جلدی سے آجا

برہ کی ماری کو ابھی تک چین نہیں آیا اور وہ کوئی موقع فال کھلوانے اور برھمن کی پوتھی کھلوانے کا موقع ھاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ عورتوں کی اوھام پرستی عام ھے۔ دیوار پر آکر کوا جب کائیں کائیں کرتا ھے اس کو اڑا دیا جائے تو مہمان کی آمد یقینی ھے۔ مفتی صاحب نے بڑا برمحل انداز اختیار کیا ھے۔ عورت کمزور مخلوق ھے لیکن پیا کے لیے جان دینے میں بھی کوئی عار نہیں۔ قاصد کے ھاتھ اپنا کلیجہ نکال کر بھیجنے کو تیار ھے کہ شاید اسی طرح پردیسی لوٹ آئے۔ مگر کوئی نجومی کوئی رمّال کوئی برھمن اسکی جدائی کا دارو نہ کر سکے۔ روتے روتے دکھ بھوگتے آٹھ مہینے گذر گئے کہیں سے ساجن کی خبر نہ ملی اب پھاگن کا مہینہ آگیا۔ ھولی پھاگن کا تہوار ھے۔ ساری سکھیاں اپنے پیتم کے ساتھ ھولی کھیلتی ھیں۔ عبیر و گلال اڑاتی ھیں۔

کرشن اور برج سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہولی ہندی شاعری کی مقبول صنف ہے۔ مفتی صاحب نے اس کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے اور جو کچھ عورت پر گذرتی ہے اس کی من و عن عکاسی کردی ہے:

تمامی رات ناچیں اور نچاویں
ستار اور نت دو تارے کو بجاویں

سحر سے شب تلک ہوری میں بھیجیں
تمامی کو رجھا ویں آپ ریجھیں

سجن پر اپنے نکتوڑا کریں ری
خوشی سے رنگ میں ہی کو بھریں ری

گلال اور رنگ سب کچھ کھیلتے ہیں
گلاب اور مشک اس میں ملتے ہیں

تمامی رات ناچیں دن کو گاویں
سکل سب نار پی کی سوں کو بھاویں

رہیں سب خوش میں او ہو پھوتی ہوں
یہ حسرت دیکھنے کو جیوتی ہوں

اری کیا ہو گیا ہنو سبھاگی
نگوڑی سوت بھی تو چھوڑ بھاگی

ماہ چیت بھی آگیا۔ اس دکھیاری کے من کی آشا اب بھی پوری نہ ہوئی۔ وہ مجسم فریاد بنی ہوئی ہے:

لگے ہے چیت رت اب کیا کروں میں
گیا جاڑا میں گرمی میں مروں ری

بہت میں نے کہا پر کچھ نہ جانا
کہا میں موء پر اوس نے اک نہ مانا

مرے وہ سوک جس نے جی جا دیا
پیا کو تجھ سے لیکر جن گنوایا

اسے بار بار خیال آتا ھے کہ پردیس میں اس کے پتی نے کسی پرائی عورت سے رشتہ جوڑ لیا ھے۔ وہ ان دیکھی سوکن سے سخت خفا ھے بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ وہ اس بات پر بھی تیار ھے کہ سوکن پیا ادھار دے دے تو وہ اس کا احسان مانے گی۔ یہاں نشاط نے نہایت اھم نفسیاتی نکتہ بیان کیا ھے کہ ھجر کی ماری ھوئی اپنے پریتم کو تو کچھ نہیں کہتی بلکہ سارا دوش سوکن پر ڈال دیتی ھے کہ اس نے پیا کو قابو میں کر لیا ھے اور وہ اسے آنے نہیں دیتی۔ آخر کو ماہ بیساکھ آجاتا ھے:

بس اب بیساکھ سر پر آن باجا
مجھے ھجراں کی آتش کا ھے ساجا
بیاباں میں پھریں اوڑتے بگولے
برہ کی سنگ میرا جیو جھولے
بسنت اور پنچھیں سب مل مناویں
سدا ھم برہنی دکھ درد گاویں
پھرے قمری خوشی آواز کرتی
سفر بر ساتھ مل کر ناز کرتی
پکارے فاختہ کوکو ادھر سے
لگا دے آگ مجھ دکھیا کی بر سے
اری جب کوکلا نے کوک ماری
لگی دل میں مرے برھا کٹاری
اری کس کنتھ میرا موہ لینا
برے دن میں مجھے جن دوکھ دینا
کہو جا کر کوئی اتنا اوسی سے
مری یہ بات اوس گھر میں بسی سے

سجن کوتیں بتا کہوں کر بچھوھا
سکھاری مجھ کو من کس طور موھا
غضب ھے تو توہی کے سنگ خوش ھو
مروں میں کنتھ بن غم سیتی رو رو
چلے ساجن کو گیارہ ماس گذرے
میرے ری انگ سے نت ماس اوترے

برھن اپنی حالت کا بیان درد بھرے انداز میں کرتی ھے۔ اس کی سکھیاں بسنت اور پنچمی منا رھی ھیں۔ قمری فاختہ کوکلا سب خوش ھیں ماسوا اس بدنصیب کے۔ ان کی آوازیں برھنی کے دل پر تیر کی طرح لگتی ھیں۔ پھر وہ تڑپ کر سوتیا ڈاہ میں متبلا ھو جاتی ھے اور سوکن سے کہتی ھے کہ تونے میرے ساجن کو کس طریقے سے اپنا کرلیا مجھے بھی بتا۔ تو تو سجنا کے ساتھ عیش کر رھی ھے میں اس بن رو رو کر جان دے رھی ھوں۔ گیارہ مہینے اسی رنج و غم میں گزر جاتے ھیں اور بارھواں مہینہ جیٹھ خوشی کا ھے۔ اس خوشی کے بیان میں نشاط اس قدر پر از نشاط نظر آئے ھیں کہ نہ صرف یہ کہ ھندی شاعری اور بارہ ماسوں کی روایت کو ایک طرف رکھ دیتے ھیں بلکہ یک بہ یک زمین اردو سے آسمان فارسی کی طرف پرواز کرنے لگتے ھیں:

گلِ بختم شگفت الحمدللہ — در دولتِ چمنِ بکشاد ناگاہ
درآمد بردل من دلبر آخر — غم ھجران من شد یکسر آخر
نہالِ اشکم آخر بار برداد — ھمائے بختم آخر بال بکشاد
کلیدے بر سر در بستۂ من — بمن باز آمد آں گم گشتۂ من
درآمد جانِ رفتہ در تنم باز — اسیرم گشت بازِ تیز پرواز
سعادت آمدہ یک سر بسویم — ندانم بعد ازاں دیگر چہ گویم

اسی تسلسل میں اور فارسی کے زور میں وہ مزید چار اشعار لکھ کر خاتمے کی طرف گریز کرتے ہیں آخری شعر یہ ہے:

بحمداللہ کہ این غم نامۂ من سرآمد از دو دستِ خامۂ من

یہ آخری شعر بہت تاریخی معلوم ہوتا ہے اور "غم نامۂ من" غالباً اس مثنوی کا اسم تاریخی ہے جس سے (۱۲۲۶ھ) برآمد ہوتا ہے۔ اگر دوسرے مصرع سے تخرجہ کیا جائے "تو دو دست خامۂ من" کے حساب سے دو کی مزید کمی کر کے من تصنیف ۱۲۲۴ھ نکلتا ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں راقم نے استاذی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب سے رجوع کیا۔ ان کا قیاس ہے کہ مصرع ثانی کے جزو "از دو دست خامۂ من" سے (۱۲۱۸ھ) مستخرج ہوتا ہے۔

بہرکیف مثنوی میں شاعر نے یہ صراحت اس شعر کو بیت تاریخی نہیں لکھا۔ اسی شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس مثنوی کو 'غم نامہ' کا نام دیا ہے۔

اس میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ سببِ تصنیف شاعر آخر میں لایا ہے، گو کہ مثنویوں کا عام طریقہ ہے کہ سببِ تصنیف بالعموم شروع میں آتا ہے۔

آخر میں اس مثنوی کے متصوفانہ پہلو پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مفتی الٰہی بخش نشاط ایک مستند عالم، ایک با عمل صوفی اور صاحبِ حال و صاحبِ قال بزرگ ہیں جیسا کہ ان کے سوانح سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس پائے کے علماء و فضلاء شعر و شاعری کی طرف کم متوجہ پائے گئے ہیں۔ ان کو شعر کی طرف لانے والا محرک ان کا اہلِ حال ہونا ہے۔ اس قبیل کے بزرگ اکثر طریقت کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ یہی شریعت و طریقت کا امتزاج ہے جو الٰہی بخش نشاط کو مثنوی مولانا روم کے

اختتام، تکملے کی طرف لے گیا، اور یہی بارہ ماسے کی طرح لایا، جس میں بظاہر کہانی عشقِ مجازی کی ہے مگر بہ باطن وہ حکایت عشقِ حقیقی کی ہے۔ چنانچہ سببِ تصنیف میں انھوں نے خود اس مثنوی کے متصوفانہ پہلو کی صراحت یوں کی ہے:

اگر سمجھے کوئی از راہِ تحقیق
خدا کے عشق میں ہیگی یہ تدقیق
پیا کو اور سجن دیکھو کہاں ہے
اوسی محبوب کا جلوہ عیاں ہے
وہ جس کے غم سے دل عالم کا خوں ہے
خرد مندوں کو سب اوس کا جنوں ہے
دلوں میں ہیگی اوس کے عشق کی آگ
جسے دیکھو اوسے ہے اوس کا ہیراگ
وہی محبوب کل، اور سب ہیں عاشق
سوا اس کے لگاوے دل، ہے فاسق
تنزہ حسن اوس کا بے مثل ہے
اوسی آتش سے عالم مشتعل ہے
خدا کا حسن ہر اک میں عیاں ہے
جہاں دیکھو اوسی کا سب نشاں ہے
چمک اوس حسن کی سب پر پڑی ہے
حسین اس واسطے حسن پری ہے
اگر اوس حسن کا جلوہ نہ ہوتا
کسی کو عشق کا خطرہ نہ ہوتا
لبھاتا ہے دلوں کو وہ ہی محبوب
اوسی سے دلربا ہوتے ہیں مرغوب

کسو کا دل کسی پر کب لبھاتا
نہ اپنا پرتو وہ جو وہ دکھاتا
چمک ذرّوں میں اوس خورشید کی ہے
نہیں اوس حسن سے خالی کوئی شے
سبھوں کو عشق اوس کا لگ رہا ہے
ہر ایک خوب اوس کی خوبی پر فدا ہے
اگرچہ سب کے پاس اور سب کے ظاہر
و لیکن ہم تو ہیں محبوب آخر
نظر اپنے میں ہی پردیس چھایا
کھلے جب معرفت تب کنتھ آیا

اسی عشقِ الٰہی کے تحت وہ رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر لاتے ہیں۔ محبوبِ حقیقی سے ملانے کا واسطہ وہی ہیں:

خبر پی کی جو قاصد لے کے آیا محمد ہی نے پی کو لا ملایا

اردو کی متصوفانہ شاعری میں یہ ایک نادر بات قرار دی جا سکتی ہے کہ عشقِ حقیقی کا وسیلہ الٰہی بخش نشاط نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس وسیلے کے بغیر محبوبِ حقیقی تک پہنچنا ممکن نہیں۔ یہ مضمون مانتے تو سب ہیں مگر یہ صراحت اردو کی متصوفانہ شاعری میں اس طور لانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ غالباً خواجہ میر درد کے یہاں بھی صریح الفاظ میں ایسی صراحت نہ ملے گی گو کہ درد اپنی شاعری میں طریقۂ محمدی کے علمبردار ہیں۔

اس کے بعد وہ وضاحت کرتے ہیں کہ ایسی عشقِ مجازی پر مبنی کہانی کی طرف میں کب متوجہ ہونے والا تھا۔ یہ تو در پردہ

میں نے عشق حقیقی کی کہانی نظم کی ہے۔ اس کو میں اپنے حق میں توشۂ آخرت جانتا ہوں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

کہاں میں اور کدھر ایسی کہانی
ولے در پردہ کہہ دی میں نے جانی
میں درد اپنا یہ در پردہ کہا ہے
دل اس کے ہجر سے ٹکڑے ہوا ہے
وہ پیارا دل میں میرے ایسا چھایا
سوا اوس کے نہیں کچھ اور بھایا
یہ جو مذکور ہے اوس دوست کا ہے
اوسی کے درد کا مقصد کہا ہے
غرض ہے جو کوئی دیکھے گا اوس کو
دعائے خیر سے بھولے نہ مجکو
یہی توشہ ہے شاید آخرت کا
مگر بخشے دعا سے حق تعالے

در حقیقت مفتی الٰہی بخش نشاط مولانائے روم کے رمز آشنا ہیں اور مثنوی معنوی کے عاشق۔ یہ مثنوی خود فراقیہ مضمون سے شروع ہوتی ہے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند

جدائی کا یہ مضمون متصوفانہ شاعری کی اصل روح و جان ہے یعنی یہ کہ تخلیق عالم کے بعد ہر مخلوق ہر شے اپنی اصل سے ملنے کے لیے بیقرار ہے۔ اس سے فنافی اللہ کا درجہ جو تصوف کے مقبول ترین درجوں میں سے ہے سامنے آتا ہے۔ یہی فراق کا مضمون الٰہی بخش نشاط کی اس فراقیہ نظم کا بنیادی مضمون ہے۔

(۳)

مفتی الٰہی بخش نشاط کی "بکٹ کہانی" کے بعد مثنوی رموزالعاشقین معروف بہ تیرا ماسہ طالب شاہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء سامنے آتی ہے۔

اب طالب کے تیرہ ماسہ کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی مطبع نولکشور میں چھپ چکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مارچ سنہ ۱۸۹۰ء مطابق رجب سنہ ۱۳۰۷ء میں چھپا تھا۔ یہ مثنوی بھی بارہ ماسے کے قبیل کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ بارہ ماسے میں بارہ مہینوں کے لحاظ سے ہجر و فراق کی کیفیات نظم کی جاتی ہیں مگر اس میں سال کے تیرہ مہینے تصور کرکے فراق نظم لکھی جاتی ہے۔ تیرھواں مہینہ لونڈ کا تصور کیا جاتا ہے۔

نشاط کے بارہ ماسے کے ساتھ اس مثنوی کا تفصیلی ذکر اس لیے جواز رکھتا ہے کہ یہ بھی عشق حقیقی پر مبنی ہے۔ چنانچہ اس کا دوسرا نام "رموزالعاشقین" اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے اور خود شاعر نے بھی نظم میں اس کی صراحت کی ہے۔ متصوفانہ بارہ ماسوں میں الٰہی بخش نشاط کے بارہ ماسہ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد ہماری ناچیز رائے میں طالب کا تیرہ ماسہ قابل ذکر ہے اور قابل مطالعہ بھی۔ چنانچہ ذیل میں اس تیرہ ماسے کا ایک مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے طالب کے حالات زندگی کی تلاش و جستجو میں خود اس کی مثنوی سے مدد لی جاتی ہے۔ اس مثنوی کی اندرونی شہادتوں کے علاوہ کوئی بیرونی شہادت ہمارے علم میں اب تک نہیں آئی۔ کسی تذکرے میں یا تاریخ ادب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ جن فضلاء نے بارہ ماسوں پر قلم اٹھایا ہے ان میں ڈاکٹر تنویر علوی نے طالب کے تیرہ ماسہ کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

البتہ ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنے مطبوعہ مقالے میں طالب کے تیرہ ماسے کا ذکر کیا ہے اور طالب کے حال میں رموزالعاشقین کے اشعار سے استدلال بھی کیا ہے مگر انھوں نے بھی کسی بیرونی شہادت کا ذکر نہیں کیا اور طالب کے حال میں بھی ایک شعر سے صرف یہ بات بیان کی ہے کہ یہ بارہ ماسہ طالب نے بندرا بن میں بیٹھ کر لکھا تھا، حالانکہ طالب کے اشعار کی اندرونی شہادت اس سے زیادہ پر دلالت کرتی ہے۔ ذیل میں اس اندرونی شہادت کی مدد سے اس کا حال پیش کیا جاتا ہے۔

حمد و نعت اور تعریفِ سخن کے بعد مثنوی میں دس اشعار "بیانِ سرگذشتِ خود" کے عنوان سے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے وطن کی کوئی وضاحت نہیں کی مگر اس قدر بیان کیا ہے کہ وطن کو چھوڑ کر وہ ایک مقام دھنساری میں جا بسے۔ اس مقام پر ان کی شاعری پروان چڑھی اور پھولی پھلی۔ چنانچہ ایک مثنوی "ماہ پیکر" کے نام سے وہاں کے قیام کے دوران لکھی۔ جب وہاں سے بھی آب و دانہ اٹھ گیا تو ایک شہری جگہ "مامور" میں ٹھکانہ کیا۔ اس جگہ یعنی مامور کے قیام میں کریما اردو زبان میں لکھی اور پھر کرانہ میں اپنا گھر بنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شہر کے ہندو اور مسلمان بہت خلیق پائے۔ کرانہ کے قیام کے دوران ایک مثنوی "ماہ رو" لکھی۔ اس مثنوی کا نام بہ صراحت انھوں نے درج نہیں کیا مگر امکاناً ماہ رو کہہ سکتے ہیں۔ پھر ان کا گذر ایک اور مقام سے ہوا۔ جسکا نام "رام ساگر" تھا۔ اس جگہ کی بھی وہ بڑی تعریف کرتے ہیں اور اسے رشکِ کوثر کہتے ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ بستی کسی جھیل کے کنارے ہوگی۔ اس جگہ رہ کر انھوں نے دو تصانیف مرتب کیں۔ ایک "وظیفۂ سحری" اور دوسری "دافع الامراض"۔

اس کے بعد وہ 'بندرا بن' کے قصبے میں پہنچے جو ہندوؤں کا ایک خاص متبرک مقام ہے۔ بندرا بن کے قیام میں دل لگا کر یہ تیرہ ماسہ لکھا جس کا دوسرا نام "رموزالعاشقین" ہے۔

تیرہ ماسے کی تمہید میں وہ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ جب سے انھوں نے رام ساگر چھوڑا تب سے ہجر و فراق کی کیفیت دل پر غالب تھی، یہاں تک کہ موسم برسات سر پر آگیا۔ اس موسم میں اکثر پردیسی سفر سے پلٹ کر گھر آجاتے ہیں۔ مگر طالب ہجر و فراق کی کیفیات سے اس قدر مغلوب ہیں کہ تلاش سکون میں بندرا بن جا نکلے، اور بندرا بن کے قیام میں بڑے ذوق شوق کے ساتھ 'تیرہ ماسہ' تصنیف کیا۔ اس کے بعد وہ یقیناً اپنے گھر کو پلٹے ہونگے جو کرانہ میں تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مردم خیز خطے نے ایک (بارہ ماسہ نشاط) ہی نہیں ایک تیرہ ماسہ بھی اردو کی فراقیہ اور متصوفانہ شاعری کو دیا۔ طالب کے مزید حالات پر مثنوی کوئی اشارہ نہیں کرتی البتہ قطعات تاریخ تالیف سے اور خاتمہ الطبع سے یہ مستخرج ہوتا ہے کہ طالب نے یہ مثنوی سنہ ۱۲۹۱ھ میں لکھی تھی۔ مادۂ تاریخ 'حب غفار' سے ۱۲۹۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

اب ہم اس کہانی کا تعارف پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اس میں حمد و نعت و منقبت کے اشعار آتے ہیں۔ حمد کے اشعار کی تعداد ۱۹ ہے۔ حمد کا پہلا شعر ہی عکاسی کرتا ہے کہ یہ تیرہ ماسہ متصوفانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔

پیا کی حمد لگتی ہے پیاری پیا میرا خدا میں اس پہ واری

بعد کے اشعار میں اوصاف خداوندی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ حمد کے اشعار میں ان کی شاعری کا مخصوص رنگ ابتدا ہی میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اشیا کی تفصیل وہ بڑے کمال

شاعرانہ کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ مثلاً خدا کی صفتِ تخلیق کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بنائے ہیں ستارے شمس و مہتاب
ہوا و خاک و آتش نور اور آب
ملائک حور و غلماں جن و انساں
پری اور دیو بھوت حیوان و شیطاں
حجر اور کوہ کیا کیا رنگ بارنگ
کہیں ہے سنگِ مرمر اور سیہ سنگ
زبرجد اور مقناطیس بلور
زمرد ہیرا پنا لعل مشہور
سلیمانی کسوٹی اور پکھراج
عقیق اور تابڑا اے صاحبِ تاج
صدف اور موتی و یاقوت و مرجان
کہیں فیروزہ و نیلم کی ہے کان
طلا تانبا و چاندی رانگ آہن
کہوں میں اور کیا اے صاحبِ فن

حمد کے بعد وہ نعت کی طرف گریز کرتے ہیں۔ اللہ کی بڑائی بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ہمیں جو جو نعمتیں اللہ کی طرف سے ملی ہیں، چشم، گوش، دنداں، عقل، ہوش، جان، اولاد، مال، زیور، زر، رزق، مگر یہ سب کس کے طفیل ملا ہے۔ یہ بقول طالب شاہ، رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ملا ہے۔ آپ کے نور کو تخلیق کرنا تھا اس لیے کائنات کو تخلیق کیا۔ اسی کے طفیل ہمیں ساری نعمتیں ملی ہیں۔ اس عمدہ گریز کے بعد وہ نعتیہ مضامین کی طرف آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس ذاتِ پاک کی کیا

تعریف کی جائے جس کی شان میں لولاک آیا ہے اس دنیا میں کفر و شرک کا زور آپ ہی نے توڑا اور یہ زور توڑنے والی چیز شریعت ہے۔ وہ مقتضائے حال کے موافق کہتے ہیں:

اسی نے کفر اور یاں شرک توڑا بنا کے اے ہوا شریعت کا کوڑا

چونکہ شعر نسوانی زبان میں ہے اس لیے شریعت کو اس طرح نظم کرنے میں کوئی ہرج نہیں خیال کیا کہ حرفِ عین گر رہا ہے۔ اس کے بعد بالا ختصار چاروں خلفائے راشدین کی منقبت آتی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ چار یار دینِ احمد کو ہویدا کرنے والے ہیں۔

حمد و نعت و منقبت کے بعد اب 'تعریفِ سخن' آئی ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ سخن یعنی شاعری سے بہتر اور کوئی شے نہیں۔ یہ فن ہر ایک پر فی‌الفور اثر کرتا ہے۔ ہر محفل میں اس کا مذکور ہے۔ اسی سے شاعر کے نام کو شہرت ملتی ہے۔ دنیا کی اور سب چیزیں عالی شان مکان، نہریں، کنویں، باغات، محلات، کوٹھیاں ان سب میں سے کسی کو بقا نہیں۔ مگر عاشق اور شاعر نہیں مرتے۔ یہ ظاہر تن ان کا بھی فنا ہو جاتا ہے، مگر سخن یعنی شاعری اور عشق ان کو زندہ رکھتا ہے۔ اس تعریف سخن سے طالب شاہ کی مراد یہ ہے کہ میری یہ مثنوی جس میں فن شاعری کے محاسن بھی ہیں اور سوزِ عشق بھی میرے نام کو باقی رکھے گی۔ یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ واقعی یہ مثنوی ان کے نام کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اب ذیل میں تیرہ ماسے کی تمہید کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہر ماہ کا جداگانہ حال لکھنے سے پہلے طالب نے تمہید کے طور پر بھی سات شعر کہے ہیں۔ جس میں بتایا ہے کہ میرے اوپر بہت مدت سے فرقت کا کرب طاری ہے جب سے رام ساگر چھوڑا اسی دم سے فرقت میں مبتلا ہوں۔ اسی فرقت کے عالم میں

برسات کا موسم سر پر آگیا۔ اس موسم میں تو جو پردیسی غریب الوطن ہوتے ہیں وہ بھی پلٹ کر اپنے گھروں کو آجاتے ہیں۔ مگر میرا حال اس کے برعکس ہے۔ اس حال کو سنانے کے لیے میں تیرہ ماسے میں اپنی بپتا نظم کرتا ہوں اس کے بعد وہ تیرہ مہینوں کی کیفیات شاعرانہ کمالات کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اس میں علاوہ متصوفانہ رنگ کے، ثقافتی پہلو بھی بہت کچھ نمایاں ہے۔ اس میں منظر کشی بھی ہے، جذبات نگاری بھی ہے اور کیا کچھ نہیں ہے۔ اس میں طرزِ نظیر اکبرآبادی کا بھی گمان ہوتا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر مونس پرکاش نے اپنی کتاب میں اشارہ کیا ہے:

> "طالب کو نظیر اکبرآبادی کی طرح اشیاء کی فہرست سازی کا بہت شوق ہے۔ درختوں، پھلوں، پھولوں، ظروف، سامانِ آرائش . . . وغیرہ کے نام بے تکان کئی کئی صفوں تک گناتے چلے جاتے ہیں"۔ ۱

اب ذیل میں اول ماہ اساڑھ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ طالب شاہ جس علاقے کے باسی ہیں۔ وہاں تین مہینے بارشیں ہوتی ہیں۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگ اساڑھ میں اپنے مکان مرمت کرا لیتے ہیں اس میں امراء غرباء سب ہی شامل ہوتے ہیں، تاکہ برسات میں تکلیف نہ ہو۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے برہ کی ماری درد بھرے انداز میں کہتی ہے کہ قرب و جوار میں جہاں نگاہ جاتی ہے ہر طرف لوگ گھروں کو بنانے سنوارتے نظر آتے ہیں مگر برہن کس سے اپنی بپتا کہے۔ میرا پیا تو ایسے وقت میں مجھے چھوڑ گیا ہے کہ میں بالکل بے آسرا ہوں۔ اگر وہ ہوتا تو وہ بھی دالان چوبارہ بناتا اور

۱۔ ڈاکٹر مونس پرکاش: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" محولہ بالا، ص ۶۳۲۔

ہر طرح کا آرام بہم پہنچاتا۔ اب تنہا میری ذات پر سارے رنج والم پڑ گئے۔ بالآخر وہ فیصلہ کرتی ہے کہ اگر معلوم ہوجائے کہ وہ کہاں گیا ہے تو میں جوگن بن کر اسے ڈھونڈھ لاؤں۔ جوگن بن کر پیا کو تلاش کرنے کا تصور داستانی مثنوی میں عام ہے۔ اس کے واضح اثرات ہمیں بارہ ماسے میں بھی ملتے ہیں۔

ساون سر پر شور مچاتا آن پہنچا۔ فرقت کی ماری ہوئی رو رو کر نڈھال ہے۔ ہر طرف ہریالی چھائی ہوئی ہے۔ پپیہا ہی ہی کرتا ہے کوئل کوکتی ہے۔ رات کو جگنو چمک کر آگ لگاتے ہیں۔ تنہائی اسے ہولا رہی ہے۔ سکھی سہیلیاں مہندی لگا رہی ہیں۔ مسی کی دھڑی ہونٹوں پر سجا رہی ہیں۔ غرض ہر طرح بن سنور رہی ہیں۔ تیج تہوار منا رہی ہیں۔ جھولا جھول رہی ہیں مگر پیا بن بے کل ہے۔ اب تو وہ خواب میں بھی نہیں آتا فرقت میں ایسی بے حال ہوتی ہے کہ وہ نجومی اور رمّال کے پاس جا پہنچتی ہے کہ شاید وہ ہی کچھ سجن کا حال سنائیں:

ارے پانڈے ذرا تو کھول پوتھی
غمِ ہجراں سے میں بھرتی ہوں روتی
اجی کھولو میاں ملا سری فال
رمل سے حال دیکھو تم بھی رمّال
منجم اب بتاؤ حال سارا
مرا گردش میں ہے کیونکر ستارا

جیسا کہ نشاط کی ہکٹ کہانی کے سلسلے میں قبل ازیں عرض کیا گیا تھا، دیہاتوں میں ضعیف‌الاعتقادی عام ہے اور سو برس پہلے تو یہ ایک عام چلن تھا کہ نجومی اور رمال سے اپنا

مشکلات حل کرانے کی تدابیر پوچھی جاتی تھیں، بالخصوص خواتین تو بڑے کمزور اعتقاد رکھتی ہیں۔ اسی غم و فکر میں ماہ بھادوں آجاتا ہے اور جنم اشٹمی کا تہوار بھی آن پہنچا۔ پردیس جانے والے سب واپس آگئے مگر اس کا پردیسی اپنے آنے کی کوئی خبر نہیں بھیجتا۔ فرقت میں حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اب تو زہر کھانے کی نوبت آپہنچی۔ کنوار بھی آگیا اور برسات ختم ہونے والی ہے کناگت کا تہوار اور دسہرہ آن پہنچا مگر سجن کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ اس کے لیے اب زندگی بےکار ہے:

گئے گزرے سکھی سولہ کناگت
ولے بدلی نہ میرے دل کی حالت
رہے تہوار کا سکھیو اپریکھا
دسہرہ کنوار بھی میں نے نہ دیکھا

اب ماہ کاتک بھی آگیا۔ سردی شروع ہوگئی ساری سکھی سہیلیاں جاڑوں کی تیاری کر رہی ہیں۔ اب طالب کا فہرست سازی کا شوق سامنے آتا ہے۔ انھوں نے رنگوں کی تفصیل پورے ایک صفحے پر پھیلادی ہے۔ وہی مختلف رنگ جو سردی کا اثر ظاہر کرتے ہیں اس میں انھیں کمال حاصل ہے:

کسی نے سر دئی اور کو کناری
رنگائی اپنے بوا پوشاک ساری
املتاسی و عباسی و طوسی
کسی نے موتی اور آبنوسی
کسی نے کتھئی اور ناختائی
کسی نے بیضئی جلدی رنگائی

اسی مہینے میں دیوالی کا تہوار آیا۔ در و دیوار روشنی میں نہا گئے مگر برہ کی ماری کا دل ڈوب رہا ہے۔ اس کی سہیلیاں کھاتی کھیلتی پھر رہی ہیں مگر وہ ہجر کی ماری ایک کونے میں منہ چھپائے پڑی ہے۔ اسی رنج و یاس کے عالم میں ماہ اگھن آگیا۔ گھر گھر جاڑے کا چرچا ہے ایسی سخت سردی ہے کہ جیسے برف کٹ رہی ہے۔ اس ماہ کے ذکر میں بھی بالتفصیل سردی کے پہننے والے کپڑوں کا ذکر ہے۔ تقریباً گیارہ اشعار اس ضمن میں آئے ہیں۔ پھر وہی ہجر و فراق کا قصہ ہے۔ کبھی خوشامد اور کبھی طنز، اور نوبت یہاں تک آئی کہ دھمکی آمیز لہجے میں سنکھیا کھانے کی بات بھی ہوگئی۔

ماہ پوس کے ذکر میں طالب شاہ نے سردیوں میں کھائی جانے والی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ چودہ اشعار اس سلسلے میں ملتے ہیں، ان میں گزک برھان، پیڑے، زردہ، یاقوتی، امرتی، ربڑی، حریر، ملیدہ قبولی غرض ایک لمبی فہرست ہے۔

ماہ ماگھ آگیا مگر اس بد نصیب کا نصیب اب بھی نہ کھلا۔ بسنت آگیا، ساری خلق خوشیاں منا رہی ہے: پہلے کپڑے رنگے جارہے ہیں، ہر شخص خوش ہے سوا اس برہنی کے۔

ماہ پھاگن بھی یوں ہی گزر گیا مگر اس کے پریتم نے کوئی خیر خبر نہ بھیجی۔ گرمیاں آگئیں۔ سب لوگ خوش خوش گرمیوں کی تیاری میں مگن ہیں۔ یہاں پھر طالب شاہ کا شوق فہرست سازی سامنے آتا ہے۔ وہ گرمیوں کی پوشاک کا ذکر سات اشعار میں کرتے ہیں۔ چکن، کامدانی، جامدانی، کریب، ململ، ڈوریا، نین سکھ، ڈھاکا پاٹن، جالی غرض شاید ہی کوئی کپڑا ایسا بچا ہوگا جس کا انھوں نے ذکر نہ کیا ہو۔ اسی مہینے کے ذکر میں وہ راگ راگنیوں کا ذکر

بھی تفصیل سے کہتے ہیں۔ بھیروں ، بیدل ، دیپک ، ہنڈول، میگھ مالا ، سری راگ ، مالکوس ، ترانہ ، سرگم ، سارنگ ، دھرپت، سندورا ، شام کلیان، کھماچ اور یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ ماہر موسیقار بھی ہیں۔ بیانیہ انداز پر طالب شاہ کو قدرت حاصل ہے۔ اسی ماہ میں ہولی کا تہوار بھی آتا ہے۔ اس کی جیسی عکاسی طالب نے کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، بلکہ ان کی تفصیل اور بیانیہ انداز کو دیکھ کر "مثنوی سحر البیان" ذہن میں آتی ہے۔ میر حسن کی طرح طالب شاہ کو بھی جزئیات نگاری پر بڑا عبور حاصل ہے۔ ان اشعار کو دیکھیے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود ہولی مناتے رہے ہیں:

کسی نے سر پہ ڈالا رنگ کا گڑوا
کوئی بولی کہ ہے ہولی کا بھڑوا
کسی نے رنگ پچکاری میں بھر کر
کسی نے قمقمہ مارا بدن پر
کوئی بولی گلال ایسا اڑا ہے
عبیر اس میں چمکتا کچھ رہا ہے
کسی نے یوں کہا مندر میں جاؤ
ہر اک مندر کی ہولی دیکھ آؤ
کوئی بولی کہ مدمنگل میں جاؤں
وہاں سے گوکلا نندن میں جاؤں
کوئی مندر میں سیتا ناتھ کے جا
کھڑے دیکھے تھی ہولی کا تماشا
کوئی جا کر کے کالی وہ نہائی
کوئی پھر کر کے کیسی گھاٹ آئی

غرض دیکھا یہ ہندرا بن میں رہ کر
ہمیشہ رہتی ہے ہولی سی گھر گھر

ہماکی جدائی کو نو مہینے گزر چکے۔ دسواں مہینا چیت کا شروع ہوگیا مگر برہن کی کلی اب بھی نہ کھلی۔ رام نومی کا تہوار بھی آگیا مگر سجن نے صورت نہ دکھائی اور ماہ بیساکھ آگیا اور برہ کی ماری کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ دن رات رونے سے کام ہے۔ نہ نیند ہے نہ بھوک۔ اب تو گلستان بھی اسے خار لگتا ہے۔ نرسنگھ چودس کا تہوار بھی آگیا مگر اسکا غم خوار اب تک نہ آیا۔ اور بالآخر جیٹھ کا مہینا شروع ہوتا ہے۔ اور سخت گرمی دھوپ اور ایسی سخت گرمی کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے۔ اس مہینے کے احوال میں بھی طالب شاہ گرمی اور اس کے لوازمات کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ خس کی ٹٹی، شربت، ستو، اولے کا لڈو، فالسے کا شربت، املی کا پنا، گنے کا رس، برف، کھیرا ککڑی مختلف انداز سے ان چیزوں کو اشعار کی صورت میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔

برہ کی ماری ہوئی اس آس پر زندہ ہے کہ ابھی لوند کا مہینہ باقی ہے شاید اس مہینے میں اس کا ستم گر آجائے:

مہینا لوند کا آیا ہے سکھیو پیا سے وصل ہوگا یاد رکھیو

لوند یعنی ادھک ماسی: تیرھواں مہینا جو ہر تیسرے سال کسرات جمع کرکے ہندو لوگ بڑھالیتے ہیں۔ اس مہینے کو مبارک سمجھتے ہیں کہ اس میں دل کی آرزو پوری ہوتی ہے۔ "مثنوی رموز العاشقین" میں طالب شاہ دیگر مثنویوں کی طرح ایک خواب دیکھتے ہیں کہ باغ ہے اور تالاب ہے، اس میں نہا دھوکر پاک ہوکر دیکھا تو ایک مرد طرحدار کھڑا ہے۔ اس نے پھولوں کا ہار پہنایا اور بڑی

مدارات کی۔ غرض یہ خواب ۵۰ اشعار پر مشتمل ھے حسب ِ دستور اپنی ساتھیوں سے اس کی تعبیر پوچھی۔ سب نے کہا کہ بڑا مبارک خواب ھے، اب پیا سے وصل کی گھڑی نزدیک ھے۔

طالب کا تیرہ ماسہ عارفانہ اور متصوفانہ رنگ لیے ھوئے ھے۔ یہاں عشق ِ حقیقی کی حکمرانی ھے اور پیا یعنی خدا تعالی تک پہنچنے کا وسیلہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ھیں۔ چند اشعار میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات، شجاعت، سخاوت، عدالت، فصاحت و بلاغت کا ذکر کرکے کہتے ھیں کہ اللہ پاک سے ملنے کا ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ و سلم کی تابعداری میں پنہاں ھے اور آپ کا لایا ھوا پیغام قرآن کی صورت میں موجود ھے۔ طالب شاہ اللہ جل شانہ سے وصل کے لیے سات گھاٹیوں کا ذکر کرتے ھیں۔ دراصل یہ سلوک کی مختلف منازل ھیں جو سالک طے کرکے حضوری حاصل کرتا ھے۔ اول علم یعنی صاحب عبادت کو چاھیے کہ وہ علم حاصل کرلے جو خاص وحدانیت کو ظاھر کرے یعنی تصوف، دوم توبہ، گناھوں سے توبہ کرے۔ عبادت خدا میں مشغول ھو۔ حرص دنیا سے بچے۔ سوم عوائق یعنی مانع کرنا راہ سلوک سے، چہارم عوارض یعنی جو پیش آئے جیسے کہ مطالبۂ رزق، پریشانی سختیاں اور مصائب ان کو خوش دلی سے جھیلے۔ پنجم خوف یعنی خوف سے عبادت کرنی۔ عُجب و ریا نہ ھو اور موت کا تصور بندھا رھے۔ ششم قوادح عجب اور ریا سے پرھیز کرے۔ ھفتم ثنا و شکر یعنی طالب عبادت کو لازم ھے کہ بعد طے کرنے سب گھاٹیوں کے حمد اور شکر خدا ادا کرے۔ "ع" شکر نعت نعمت افزوں۔ پھر صبر کرے کہ "الصبر مفتاح الفرج"

ان منازل کو طے کرنے والا بالآخر وصل ِ محبوب سے ھمکنار

ہوتا ہے، ورنہ دوسری صورت میں جہنم کی آگ لپیٹ میں لینے کے لیے تیار ہے۔ اس سلسلے میں سات اشعار ملتے ہیں۔ اس کے بعد جنت کے احوال میں ۵۴ اشعار ملتے ہیں جو زنانی بولی میں روانی کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں۔ جنت کی آرائش و آسائش، عیش و آرام، سکون و اطمینان، اشیائے خورد و نوش کی فروانی، چمن کی بہار، غرض کیا کچھ نہیں ہے جس کو طالب شاہ نے نہایت عمدہ طریقے سے شعری اسالیب میں نہ ڈھال دیا ہے۔ طالب کی محاکات نگاری ان کے ذوق تجسس ژرف نگاہی کی آئینہ دار ہے۔ گو مثنوی رموزالعاشقین معروف بہ تیرہ نام ایک مختصر مثنوی ہے لیکن اس میں بے تحاشا معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے بعد کے اشعار وصل کی تیاری کے سلسلے میں ہیں۔ ان میں دلھن کی تیاری کے سلسلے میں جو لوازمات درکار ہوتے ہیں ان کا سلسلہ تصوف سے جوڑ دیا ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں :

سراپا آب توبہ سے نہا کر
سنگھار اپنا جو کر گوشہ میں جا کر
سکھی بالوں کی کنگھی کر فنا کی
ہوا پھر عطر ملنا تن پہ خاکی
ارے پشواز اور جوتی کا جوڑا
گلے میں ڈال پھر توبہ کا توڑا
گلے میں ڈالنا تقوے کی ہیکل
کہ جس سے پھر کبھی دل ہو نہ ہلچل
طریقت کی تو بجلی کان میں ڈال
ہوس کی مچھلیاں دے کان سے ٹال

آخر میں طالب شاہ نے تیرہ ماسے کا خلاصہ اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اگر مصیبت میں پڑھا جائے تو تیرہ دن کے اندر یہ مصیبت ٹل سکتی ہے۔ یعنی یہ ایک طرح "حل المشکلات" کا وظیفہ ہے۔ اسی خلاصے میں وہ نصیحت کرتے ہوں کہ اس تیرہ ماسے کو پڑھتے وقت خدا کے سوا کسی کا دھیان نہ رکھے اور یہ کہ دنیوی محبت جی کا جنجال ہے۔ خدا کے واسطے فی الحال اس کو اس کو چھوڑ دے۔ اگر خدا سے دل مل گیا تو پھر دین دنیا سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ پھر وہ خدا کی محبت کے ذیل میں کچھ شاعرانہ مثالیں بھی لائے ہیں۔ مثلاً قیس و لیلیٰ، شیریں و فرہاد یوسف و زلیخا کا ذکر اسی ذیل میں آتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ابن علی نے کربلا میں اپنا سر اسی محبت کے سبب فدا کیا تھا، اور حضرت ایوب بیمار ہوئے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ دار پر چڑھے تھے اور سرمد کا سر قلم ہوا تھا۔ اور منصور سولی پر چڑھا تھا۔ غرض کہ خدا کی محبت اصل چیز ہے اور یہ حقیقت اور معرفت کا نکتہ ہے۔ پھر وہ کتاب سراج السالکین کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ اگر دل میں شک ہو تو سراج السالکین پڑھو۔ یہی تیرہ ماسے کا آخری حصہ ہے۔

طالب کے تیرہ ماسے کی انفرادیت:

ہماری نزدیک چند نکات ایسے ہیں جو طالب کے تیرہ ماسے کے ساتھ خاص ہیں۔ ان خصوصیات کے اعتبار سے یہ ایک منفرد مثنوی ہے جس کی ان خاص خصوصیات میں کوئی بارہ ماسہ شریک نہیں۔

۱۔ طالب کے تیرہ ماسے میں جنت کا بیان خاصی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ منفرد بات یہ ہے کہ جنت میں بہ کثرت ایسی اشیا جمع کردی ہیں جس سے جنت پر ہندی رنگ غالب آجاتا ہے مثلاً

چھتر، تکیہ، چنور، بنت، گوکھرو، کناری، مقیش، سواریون میں رتھ۔ بھلی، شکرم یکہ، نالکی، نباتات میں پان، پنا، ڈھاک، بڑ، وغیرہ۔ پھل میں گوندنی، جامن، آم، کیلا، املی۔ کٹھل، بیل، امرود، غرض اسی طرح برتنے کھانے پینے کی اشیا، چرند، پرند، پھل، سب کے بیان میں یہ کثرت ہندی ناموں کی بھر مار ہے۔

دوسری منفرد بات یہ ہے کہ اس میں دلہن کی تیاری کے لیے جو نکات بیان کیے گئے ہیں تصوف کے نکات سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ نصیحت کہ آبِ توبہ سے نہا کر سنگھار کر، بالوں میں کنگھی فنا کی کر، عطر خاکی مل، کپڑے معرفت کی بخیہ کرکے پہن۔ گلے میں تقوے کی ہیکل، طریقت کی بجلی۔

یہ انداز مشہور عالم حسن بصری کے نسخے سے مستفاد معلوم ہوتا ہے۔ نسخے میں منفرد تواضع کے درختوں کی جڑیں توبہ کے ہلیلج، رضا کا ہاون، قناعت کا کھرل، تقوے کی ہانڈی اور اس میں حیا کا پانی انڈیل کر محبت کی آنچ میں جوش دینے کا ذکر آتا ہے۔

تیسری منفرد بات اس مثنوی میں یہ ہے کہ آخر میں محبتِ دنیاوی کو جی کا جنجال کہہ کر اس کی طرف سے دل پھیرا گیا ہے اور نصیحت کی گئی ہے کہ خدا کی محبت طلب کر، اگر خدا سے دل مل گیا تو پھر دین و دنیا دونوں تجھکو حاصل ہوجائیں گی۔

(۴)

خاتمہ:

حاصلِ کلام یہ ہے کہ نشاط کی "ہفت کہانی" اور طالب کا تیرہ ماسہ، دونوں تصوف کے رنگ کی مؤثر اور دلپذیر مثنویاں ہیں اور دونوں صاحب حال اہلِ تصوف کے قلم سے نکلی ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض اوپری اور سطحی یا محض شاعرانہ

باتیں نہیں ہیں بلکہ صحیح معنوں میں "از دل خیزد و بر دل ریزد" کی مصداق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے بارہ ماسوں کی تاریخ میں دونوں ایک منفرد مقام پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ طالب کے تیرہ ماسے میں تصوف کے ساتھ شعری اسالیب کی چاشنی اور زیادہ شامل ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مثنوی شعری لحاظ سے قابل توجہ اور قابلِ التفات ہے جبکہ منصوفانہ بارہ ماسوں میں نشاط کی بجائے کہانی کو اولیت حاصل ہے۔

کتابیات

۱۔ ابوالحسن علی ندوی: "تاریخ دعوت و عزیمت"، حصہ پنجم، کراچی، مجلسِ نشریات اسلام، ۱۹۸۴ء۔

۲۔ ایضاً: "سیرت سید احمد شہید"، حصہ اول، لکھنؤ، مجلسِ نشریات اسلام، ساتواں ایڈیشن، ۱۹۸۶ء۔

۳۔ پرکاش سونس، ڈاکٹر: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، دھلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۸ء۔

۴۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر: "اردو میں بارہ ماسے کی روایت: مطالعہ و متن"، دھلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء۔

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: "تاریخ ادب اردو (جلد اول)"، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء۔

۶۔ خویشگی، نصراللہ خاں: "گلشن ہمیشہ بہار"، مرتبہ اسلم فرخی، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۶۷ء۔

۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: "ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ"، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۵ء۔

۸۔ سید محمد: "ارباب نثر اردو" (طبع دوم)، حیدرآباد دکن، مکتبۂ ابراہیمیہ ۱۹۲۷ء۔

۹- شیرانی، حافظ محمود خاں: "پنجاب میں اردو"، لاہور، آئینۂ ادب، طبع چہارم، ۱۹۷۲ء۔
۱۰- ایضاً: "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء۔
۱۱- شیفتہ، مصطفےٰ خاں: "گلشن بے خار" (مرتبہ کلب علی خاں) لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول ۱۹۷۳ء۔
۱۲- عبیدہ بیگم، ڈاکٹر: "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، لکھنؤ، نصرت پبلشرز، ۱۹۷۳ء۔
۱۳- عتیق صدیقی، محمد: "گلکرسٹ اور اس کا عہد"، علی گڑھ، انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۶۰ء۔
۱۴- عبدالقادر سروری: "اردو مثنوی کا ارتقا" طبع دوم، ۱۹۶۸ء۔
۱۵- گارسیں دتاسی: "خطبات گارساں دتاسی" (حصہ اول و دوم)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۴ء۔
۱۶- عبدالغفور نساخ: "سخن شعراً" لکھنؤ، اتر پردیش اکادمی، ۱۹۸۲ء۔

رسائل

۱- خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا: "شمالی ہند میں اردو زبان کا آغاز اور ابتدائی ارتقا" خدابخش لائبریری جرنل (شمارہ ۴۷) ۱۹۸۸ء۔
۲- نورالحسن راشد: "فہرست مخطوطاتِ اردو، مفتی الٰہی بخش اکادمی، کاندھلہ"، مشمولہ، خدابخش جرنل پٹنہ شمارہ ۴، ۱۹۸۸ء۔